آپ بیتی کی روشنی میں

مودودیت بے نقاب

از عبد القدوس رومی (مفتی شہر آگرہ)

ناشر: صہیب برادرس آگرہ

آپ بیتی کی روشنی میں

مودودیت بے نقاب

از

عبدالقدوس رومی۔ مفتی شہر
جامع مسجد آگرہ

ناشر :- صہیب برادرس - آگرہ

~~قیمت تین روپئے~~ ۳

8/=

ناشر	صہیب برادرس ۹۸/۱۱ صابن کٹرہ۔ آگرہ ۳
کاتب	قربان علی
طابع	نیشنل آرٹ پرنٹرس۔ الہ آباد
تعداد اشاعت	ایک ہزار
سال اشاعت	مئی ۱۹۷۹ء (بار اول)

قیمت
8/=

:- ملنے کے پتے :-

۱۔ صہیب برادرس ۹۸/۱۱ صابن کٹرہ۔ آگرہ

۲۔ مکتبہ نعمانیہ۔ دیوبند۔

۳۔ ہندوستانی کتب خانہ۔ نظام الدین۔ دہلی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدمہ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم: زیر نظر کتابچہ میں تحریک مودودیت کے صحیح اور اصلی خدوخال کو چند آپ بیتیوں کی روشنی میں نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان آپ بیتیوں کو پیش کرنے سے پہلے ان تمام حضرات کا مختصر تعارف ضروری ہے۔ جن سے یہ آپ بیتیاں تعلق رکھتی ہیں۔ یا جن حضرات کا ذکر ان میں آگیا ہے۔ اس سلسلے میں احقر نے اپنے بزرگ محترم حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی دامت برکاتہم سے رجوع کیا اور ان سے ان حضرات کا تعارف حاصل کرنا چاہا۔ موصوف نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے آئندہ سطور میں بعینہٖ حضرت موصوف ہی کے الفاظ میں نقل کئے دیتا ہوں۔

۱۔ شمس الحسن صدیقی صاحب: حافظ پر زور ڈالنے سے یاد آسکے۔ ان کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ یہ غالباً سہارنپور کے متوطن تھے۔ "دارالاسلام پٹھان کوٹ" کے ابتدائی مقیمین میں یہ بھی تھے۔ غالباً مودودی صاحب وغیرہ کے ساتھ ہی ۱۹۴۷ء میں پاکستانی ہوئے ہونگے دارالاسلام کے زمانہ قیام کے بعد ان سے غالباً کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی جماعت اور مودودی صاحب سے علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی، حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور ان (شمس صاحب)، کے جن مضامین کا آپ نے ذکر کیا ہے کہ میں بھی ان کے دیکھنے کا مشتاق ہوں۔ دونوں بہت قابل اعتماد آدمی ہیں۔

۲۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب تو جماعت اسلامی کے "سابقین اولین" میں تھے مسلکاً اہلحدیث ہیں بڑے مخلص ہیں۔ المنیر ان کا ہفتہ وار رسالہ ہے، میرے دوستوں میں ہیں

مارچ کے الفرقان کے نگاہ اولین میں ان کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ ان حضرات میں سے ہیں جنھوں نے ۵۷ء ۵۸ء میں جماعت کو اور مودودی صاحب کو چھوڑا۔

۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی کے بارہ میں یاد آیا کہ انھوں نے ۵۶ء میں جب وہ اندرونی اختلاف شروع ہوا ہے جسکی تفصیل آپ کو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتاب سے معلوم ہو چکی ہے۔ تو مودودی صاحب کو بہت تفصیلی خط لکھا تھا۔ جو گویا ایک رسالہ تھا۔ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب ہی نے مجھے اسی زمانہ میں اس کی ایک کاپی دی تھی جو محفوظ نہیں۔ ممکن ہے حکیم صاحب سے آپ کو مل سکے۔ (افسوس کہ ان سے بھی نہ مل سکی۔ رومی)

۴۔ سندی محمد صدیق صاحب کے بارہ میں خط میں اس سے زیادہ نہیں لکھا جاسکتا کہ جو میں نے کسی مضمون میں لکھا ہو گا۔ کبھی آپ سے ملاقات ہو تو تفصیل سے ان کا تذکرہ کر سکوں گا۔ بہت غیر معمولی قسم کے آدمی تھے۔ ان کا ایک مستقل مسلک تھا جس میں غالباً وہ منفرد تھے (حضرت مولانا نے انھیں سندی صاحب کے متعلق اپنی سیاسی آپ بیتی میں جو "جماعت اسلامی سے مجلس مشاورت تک" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ تحریر فرمایا ہے "سندی صاحب جماعت اسلامی کے اس وقت کے ارکان میں بہت ہی عجیب و غریب قسم کے ایک مخلص اور متقی بزرگ تھے۔ اصطلاحی عالم دین تو نہ تھے۔ لیکن دین کے تقاضوں کو سمجھنے والے تھے۔ قرآن مجید غور و فکر کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ان کو قرآن پاک سے عشق تھا۔ نماز تو اتنی اچھی پڑھتے تھے کہ ایسی نماز پڑھنے والے میں نے اپنی پوری عمر میں اللہ کے چند ہی بندے دیکھے ہیں۔ اپنے خاص احوال و نظریات کے لحاظ سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے انھیں بڑی مناسبت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت نصیب فرمائی۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وارفع درجاتہ۔ آمین

۵۔ غازی عبدالجبار صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ مرد مومن تھے مسلکاً اہل حدیث تھے۔ دریا گنج دہلی کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ بڑے مخلص تھے

غالباً کرنال کے متوطن تھے۔ ان لوگوں میں تھے۔ جنہوں نے جماعت اسلامی میں شامل ہو کر اپنی دنیا کو گویا قربان کر دیا۔ جماعت کے صف اول کے لوگوں میں تھے۔ حکیم عبدالرحیم اشرف وغیرہ کے ساتھ ہی انہوں نے ۴۵ء میں جماعت سے علٰحدگی اختیار کی تھی۔

۶۔ مولانا سید صبغۃ اللہ بختیاری دارالعلوم دیوبند کے فاضل صاحب درس اور ہماری جماعت کے جنوبی ہند کے مشاہیر میں سے ہیں۔ عمر مجھ سے کچھ کم ہو گی۔ ستر سے متجاوز ہو چکے ہوں گے۔ علاقہ مدراس ویلور میں ایک بہت قدیم اور بڑا مدرسہ "الباقیات الصالحات" ہے مدت سے اسمیں شیخ الحدیث یا استاذ حدیث ہیں۔ یہ بھی ہم لوگوں کی طرح جماعت اسلامی کے "سابقین اولین" میں تھے۔ پھر علحدگی اختیار کر لی۔ یہ معلوم نہیں کہ کب علٰحدہ ہوئے۔

۷۔ قمرالدین صاحب۔ بنارس کے تھے۔ ایم اے تھے۔ جماعت کی تاسیس کے پہلے سے مولانا مودودی کے خاص رفقاء میں تھے۔ مودودی صاحب کے دارالاسلام منتقل ہونے سے پہلے وہ ان کے ساتھ لاہور میں رہتے تھے۔ پھر ان کے ساتھ ہی دارالاسلام میں آگئے تھے۔ دارالاسلام کے ابتدائی زمانہ قیام میں ہی یہ غیر مطمئن ہو گئے تھے۔ اور ارکان جماعت میں سب سے پہلے غالباً مجھ سے بھی پہلے) علحدگی کا جن ۲۔۳ صاحبان نے فیصلہ کیا تھا ان میں یہ بھی تھے۔ (میرے دو تین مہینے غور و فکر میں گذرے تھے۔) سنہ ۴۶ء میں یہ بھی منتقل ہو گئے تھے۔ بعد میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اور حال معلوم نہ ہو سکا۔" (حضرت مولانا نعمانی مدظلہٗ کی تحریر کا اقتباس ختم ہوا۔

پیش نظر مجموعہ میں پانچ حضرات کی "آپ بیتیاں" شامل ہیں۔ جنکی تفصیل یوں ہے،

(۱) پہلی "آپ بیتی" جناب شمس الحسن صاحب صدیقی کی خود نوشت ہے۔ جو نوائے پاکستان مورخہ ۴ ستمبر ۵۵ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ راقم السطور نے اخبار مذکورہ سے ہی نقل کی ہے۔ اور نقل میں صرف اتنا تصرف کیا ہے کہ موصوف نے اپنی اس "آپ بیتی" میں اپنے دو خواب بھی تحریر فرمائے تھے۔ احقر کے نزدیک ان کا ذکر غیر ضروری تھا۔ اسلئے از راہ اختصار

حذف کر دیا۔ افسوس کہ حکیم صاحب کے مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔ جو کچھ انہوں نے خود ہی تحریر فرمایا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف سہارنپور یا اسکے اطراف ہی کے رہنے والے تھے۔

(۲) دوسری "آپ بیتی" جناب حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کی ہے۔ جن کے کچھ حالات خود ان کی تحریر سے اور کچھ حالات حضرت مولانا نعمانی کے مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ موصوف کا یہ بیان ان کے اپنے رسالہ "المنبر مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۸ء" سے منقول ہے۔

(۳) تیسری "آپ بیتی" ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے متعلق ہے۔ جو موصوف کی ایک مفصل تصنیف "تحریک جماعت اسلامی ایک تحقیقی مطالعہ" سے تلخیص و اختصار کی شکل میں راقم السطور نے ترتیب دی ہے۔ اور اس کی امکانی کوشش کی ہے۔ کہ یہ "آپ بیتی" موصوف ہی کے الفاظ و تعبیر سے تیار ہو جائے۔ موصوف نے اپنے حالات بھی کسی حد تک تحریر فرما دیئے ہیں۔ احقر نے وہ خود نوشت احوال بھی اپنی تلخیص میں شامل کر دیئے ہیں

(۴) چوتھی "آپ بیتی" جناب مولانا حکیم عبیداللہ خانصاحب کی ہے جو مسلکا اہل حدیث ہیں وطن اصلی رائے بریلی ہے لیکن مدت سے سرینگر میں مقیم ہیں۔ یہ "آپ بیتی بھی راقم السطور کی تلخیص و ترتیب سے تیار ہوئی ہے۔ اور اس کا سارا مواد حکیم صاحب موصوف کی مفصل تصنیف اسلامی سیاست یا سیاسی اسلام! سے لیا گیا ہے۔ موصوف نے بھی اپنے حالات پر کہیں کہیں کچھ روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے علحدہ سے کسی تعارف کی ضرورت نہ رہی۔

(۵) پانچویں "آپ بیتی" جناب وحیدالدین خانصاحب کی ہے۔ جو جماعت اسلامی ہند کے سابق رکن اور اسکے شعبۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ یہ "آپ بیتی" موصوف ہی کی ایک کتاب "دین کی سیاسی تعبیر" سے بطور تلخیص تیار کی گئی ہے۔ جو موصوف کی ایک مفصل کتاب "تعبیر کی غلطی" کا خود نوشت خلاصہ ہے۔

چند ضروری وضاحتیں

پہلی وضاحت

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ احقر نے بڑی حد تک کوشش تو یہی کی ہے کہ ہر شخص کی "آپ بیتی" صرف اسی کے الفاظ و عبارات ہی سے مرتب کر دی جائے۔ لیکن کہیں کہیں فتنہ کی خطرناکی کے احساس سے مجبور ہو کر بریکٹ میں کچھ وضاحت واضافہ بھی کرنا پڑ گیا ہے۔

دوسری وضاحت

ان آپ بیتیوں کی مجموعی اشاعت سے مقصود یہ دکھلانا ہے کہ علامہ مودودی کی تحریک حکومت الٰہیہ اور تحریک اقامت دین کی حقیقت جسکے متعلق موصوف کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ تحریک "انھیں خطوط پر قائم کی گئی ہے جن خطوط پر ابتدائی دور نبوت میں دعوت اسلام کی تحریک چلائی گئی تھی"۔

ناظرین کھلی آنکھوں دیکھ لیں کہ اس اصلی دعوت اسلام اور اس نقلی تحریک اسلام میں کتنا واضح فرق یہ موجود ہے کہ دور نبوت کے آغاز میں جو شخص بھی حلقہ اسلام میں داخل ہوا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسلام ہی کا ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ شاہ حبشہ نے جب حضرات مہاجرین سے کچھ سوالات تحقیق حال کے لئے کئے تھے ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا جو شخص اس نئے دین میں داخل ہو جاتا ہے پھر وہ اس سے برگشتہ بھی ہوتا ہے۔ جواب میں کہا گیا کہ نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ اسلام کے دور اول کی اس تصویر کے بالکل برخلاف آپ دیکھیں گے کہ علامہ کی تحریک اسلام میں جتنے بھی سابقین اولین تھے تقریباً سب ہی برگشتہ و منحرف ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیئے جو کسی زمانہ میں علامہ نے اپنے معترضین کی زبان بندی کیلئے فرمائی تھی۔ کہ میری بات اگر صحیح نہ ہوتی تو فلاں فلاں صاحبان

(حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی وغیرہ) میرے ساتھ کیوں ہوتے؟ مگر اس ہٹ دھرمی کا علاج کس کے پاس ہے کہ وہ سب حضرات جو علامہ کے برحق ہونے کا ثبوت تھے وہ سب ہی علامہ کو گمراہ سمجھ کر علحدہ ہو گئے۔ لیکن خود علامہ اور ان کے معتقدین کو اب بھی اپنے برحق ہونے پر اصرار ہے۔ یہ ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے؟

تیسری وضاحت ان آپ بیتیوں میں بڑی حد تک باہم یکسانیت اور نقطۂ اختلاف میں اشتراک کے باوجود کہیں کہیں حضرات ناظرین کو شاید کچھ فرق بھی محسوس ہوگا۔ اسکی وجہ غالبًا یہ ہے کہ علامہ مودودی کی تحریک میں جو حضرات علامہ موصوف کی غیر صالح زندگی کے باعث شروع سے ملطمئن نہ تھے۔ اور محض ان کی خوش آئند تحریرات کے جادو سے متاثر و مسحور ہو کر اس سے وابستہ ہوئے تھے۔ اور یہ امید بھی لگائے ہوئے تھے کہ وہ اپنی شرکت کے بعد علامہ کو متاثر کر کے صالح قیادت کا حقدار بنالیں گے۔ انھیں جیسے ہی اپنی اس خوش فہمی کا اندازہ و احساس ہوا وہ جماعت سے الگ ہو گئے اور کسی قدر صاف طور پر ہی علامہ کی قیادت سے مایوسی اور ان کی فکری کجی کا اظہار فرمادیا۔ لیکن بعض حضرات شاید ایسے بھی تھے جو اپنی حد تک تو دینی طلب میں مخلص تھے لیکن دینی بصیرت و معلومات کی کمی کے باعث علامہ کو صالح دینی قیادت کا بجا طور پر مستحق بھی سمجھ بیٹھے تھے۔ پھر بعد کے حالات میں جب انھیں اندازہ ہوا کہ جماعت کی گاڑی پٹڑی بدل جانے کی وجہ سے بالکل غلط سمت کو چل پڑی ہے۔ تو وہ جماعت سے علحدہ تو ہو گئے مگر لیکن علامہ کے ساتھ بیجا و غلط قسم کا جو حسن ظن پہلے سے تھا اسکی وجہ سے وہ علامہ کی طرف سے کلیتہً مایوس کبھی نہیں ہوئے اور ان کے دل کے کسی گوشہ میں یہ حسن ظن اب بھی خفیہ حالت میں موجود ہے۔ کہ شاید علامہ کو کسی وقت پٹڑی بدل جانے کا احساس ہو جائے۔ اور وہ پھر صحیح راہ پر آجائیں۔

راقم السطور نے اپنے اکابر کے وجدانیات واستدلالات کی روشنی میں اس تحریک کو جو کچھ سمجھا

ہے وہ یہ کہ اس تحریک کا سلسلہ نسب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اسلام سے
مطلق تعلق نہیں رکھتا۔ اور یہ دین اسلام کی ایسی عصری تشریح ہے کہ جو تشریح نبوت
سے سرتاسر مختلف ہے جیسا کہ احقر کے کتابچہ "تحریک مودودیت کی ایکسرے رپورٹ"
میں اچھی طرح نمایاں کر دیا گیا ہے۔

(عبدالقدوس رومی۔ مفتی شہر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ بیتی ۔ا

ـــــ نام نہاد جماعت اسلامی کے اندر میں نے کیا دیکھا؟

جماعت کے لٹریچر کو قرآن وحدیث پر ترجیح دینے کی تلقین

(از:۔ جناب حکیم شمس الحسن صاحب صدیقی سابق استاد درسگاہ اسلامی دارالاسلام

(منقول از نوائے پاکستان لاہور ۲۴ ستمبر ۵۵ء ـــــــــــــــــ

میں تو حضور ایسے دوآبہ کا رہنے والا ہوں جسکے متعلق اورنگ زیب نے بے اعتقادوں کے علاقہ کا خطاب بخشا ہے ۔ اور غالباً یہی عدم اعتقاد کی کیفیت تھی جو مجھ کو" جماعت اسلامی میں نہ رکھ سکی ۔

الحمدللہ کہ مجھ پر یہ الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ میں نے جماعت اسلامی سے بیزاری کا اظہار کر کے علٰحدگی اختیار کی ۔ بلکہ جماعت میرے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی تھی اسلئے مجھ کو نکال کر پھینک دیا گیا اور مجھ جیسے ذہنی باغی کو نکال کر جماعت کی تطہیر کی گئی ـــــــــــــــ ترتیب کے لحاظ سے

تو وہ چند اشعار جو میں نے دارالاسلام سے نکالے جانے کے بعد کہے تھے ۔ کئی روز کے بعد آتے ہیں مگر یہ ظلم ہو گا کہ میں ان کو سب سے پہلے عرض نہ کر دوں ۔ آپ یوں سمجھئے کہ وہ غزل عنوان قصہ صنعت براعت استہلال کے طور پر عرض کی گئی ہے ۔ ملاحظہ ہو :۔

غزل :- "کچھ ایسا بھی دیکھا ہے جو کھل کر نہیں کہتے"

(۱) ہر صاحب افسر کو سکندر نہیں کہتے — ہر تارک دنیا کو قلندر نہیں کہتے
(۲) ہر صاحب ادراک فلاطوں نہیں ہوتا — ہر ہادی و رہبر کو پیمبر نہیں کہتے
(۳) باطل پہ جو مٹ جائے وہ جانباز نہیں ہے — ہر ایک مبارز کو غضنفر نہیں کہتے
(۴) ہر جوئے رواں حسرت فرہاد نہیں ہے — ہر آب معطل کو سمندر نہیں کہتے
(۵) اللہ نے بخشا ہے جنہیں دیدۂ بینا — ہر آنکھ کو وہ چشم فسوں گر نہیں کہتے
(۶) ہم حضرت واعظ کو ہر اک رنگ میں دیکھ آئے — کچھ ایسا بھی دیکھا ہے جو کھل کر نہیں کہتے
(۷) ہر ایک حسیں رتبۂ ساقی نہیں پاتا
ہر رند خرابات کو اختر نہیں کہتے

جماعت اسلامی میں شمولیت و داخلہ

مئی ۴۰ - ۱۹۳۹ء میں بہاول پور کالج میں بحیثیت ہیڈ لیبارٹری اسسٹنٹ ملازم تھا۔ ملازمت مستقل تھی۔ گرمی کی چھٹی میں اپنے وطن واپس چلا جاتا انہیں ایام میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ مجھے اپنی برادری کی ترتیب و تنظیم کا احساس ہوا۔ چنانچہ اس کے لئے میں نے کام شروع کر دیا۔ اور میرے اکثر بزرگوں نے اس میں میری ہمت افزائی کی۔ خصوصاً مولانا منظور الٰہی صدر ضلع کانگریس۔ خواجہ اطہر حسن صدر جمعیۃ العلماء شہر۔ شاہ نذر حسن صاحب مرحوم صدر ضلع مسلم لیگ۔ مولانا محمد الیاس صاحب، محتشم مرحوم۔ حافظ محمد یوسف صاحب انصاری مرحوم (نبیرہ[ع] حضرت قبلہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی)۔ وغیرہ۔ یہ کام کچھ اس طرح پھیل گیا کہ میں اس کو تین ماہ کی مدت میں مکمل نہ کر سکا۔ میں نے چاہا کہ اس کام کو کسی کے سپرد کر کے واپس چلا جاؤں۔ لیکن مولوی محمد الیاس صاحب وکیل جیسے محترم بزرگوں نے مجھے مجبور

ع احقر کے علم میں یہ ہے کہ موصوف حضرت گنگوہی کے نواسے تھے۔ رومی

کیا کہ میں کام کو جاری رکھوں چنانچہ میں نے کالج سے مزید چار ماہ کی رخصت حاصل کی۔

واپسی پر میں نے ارادہ کیا کہ میں مودودی صاحب سے بھی ملاقات کروں جو اس زمانہ میں مبارک پارک یا اسلامیہ پارک میں قیام فرما تھے۔ مجھ کو چند ہی ماہ پہلے میرے کیمسٹری کے پروفیسر چودھری محمد افضل صاحب مرحوم نے مولانا کی سیاسی کشمکش سے روشناس کرایا تھا اسکے علاوہ میں نے سرسری مطالعہ ترجمان القرآن کا بھی کیا تھا۔ اور اس میں میں نے وہ کچھ پایا تھا جو میرے ضمیر کی آواز تھی۔ چنانچہ بہاولپور سے بعد رخصت واپسی پر میں لاہور میں مولانا سے ملا اور میں نے بہت اختصار کے ساتھ مولانا سے ترتیب جماعت کے موضوع پر گفتگو کی۔ میں نے مودودی صاحب سے عرض کیا کہ یہ کام افراد کے کرنے کا نہیں ہے۔ اس دور میں حضرات سابق کی منفردانہ سعی ہمارے سامنے موجود ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ نظام اسلامی کے احیاء کے لئے جماعتی حیثیت سے کوشش کی جائے۔ مگر اس جماعت کی حیثیت اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگی کہ وہ ملت اسلامیہ کے ایک جزو کی طرح ہوگی۔ اور مسلمانوں میں کسی فرقہ کی نئی بنیاد نہیں بن جائے گی۔

مودودی صاحب نے اس سے اتفاق فرمایا۔ اور کہا کہ میں بہت پہلے سے اس پر غور کر رہا ہوں اور ابھی کچھ اور لوگوں سے خط و کتابت ہو جائے تو پھر میں جماعت کی تشکیل کروں۔

میں نے کہا کہ میں اس مقصد میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔

کافرانہ نظام کی ملازمت چھوڑ دو

پھر میں نے عرض کیا کہ میں نے رخصت بیماری کا سبب ظاہر کر کے حاصل کی ہے۔ یہ تو درست نہیں ہوگی۔ اور یہ کہ میں برادری کی تنظیم پر لگا ہوا ہوں۔ یہ کام بھی مجھے کرنا ہے۔

مودودی صاحب نے فرمایا کہ ملازمت تو ایک کافرانہ نظام میں کل پرزے کی حیثیت ہے۔ اور رخصت کا یہ طریقہ یقیناً غلط ہے۔ برادری کی تنظیم ایک مختصر کام ہے۔ آپ اپنی اچھی صلاحیتیں ملت اور اسلام کے کام میں لائیے وہ زیادہ بڑا کام ہے۔

میں وطن پہونچ گیا۔ برادری کی تنظیم اور ترتیب کی طرف سے بھی میں نے کسی قدر

اعتنائی اختیار کرلی جو آخر میں اس کام کے ختم ہو جانے پر منتج ہوئی۔

رخصت کے ختم ہوتے پر میں نے آٹھ نو سال کی ملازمت سے اس بنا پر استعفیٰ دے دیا کہ میں "طاغوتی نظام" سے منسلک نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس عرصہ کے دوران قمر الدین خاں صاحب سابق قیم جماعت اسلامی حال استاد اردو کالج کراچی کا گرامی نامہ مجھے ملا کہ میں نے جماعت کی تشکیل کے مسئلے پر غور کر لیا ہوگا۔ اور اب کسی نتیجہ پر پہنچ گیا ہونگا۔ لہٰذا میں اپنی رائے اور اجتماع اول کیلئے جگہ کا انتخاب اور اجتماع بلانے کی مناسب تاریخوں سے مطلع کروں۔

میں نے اس کا جواب وہی دیا جو مودودی صاحب کو زبانی دے آیا تھا۔ اور جگہ وغیرہ ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ مجھے پہلے اجتماع کی تاریخوں اور مقام سے مطلع کیا گیا اور میں نے اس میں شمولیت کی۔

پہلا اجتماع

یہ اجتماع مودودی صاحب کے بنگلہ کے ہال میں ہوا تھا۔ مہمانوں کے لئے ایک مکان کا قریب ہی انتظام کیا گیا۔ مہمانوں میں مولانا محمد منظور نعمانی۔ مولانا صبغت اللہ بختیاری۔ مستری محمد صدیق صاحب۔ الہ آباد کے ایک ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر سید نذیر علی زیدی مراد ہوں گے۔) محشر رسول نگری صاحب۔ مولانا جعفر شاہ صاحب وغیرہ تھے۔

یہ اجتماع یقیناً مخلصین کا اجتماع تھا۔ حالانکہ مہمان حضرات ایک دوسرے سے عموماً کوئی واقفیت پہلے سے نہیں رکھتے تھے۔ مگر خالص دین کی خدمت کے ایک مقصد نے سب کو ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیا تھا کہ مدتوں کے مخلص احباب معلوم ہوتے تھے

میں نے بہت مذہبی اجتماعات دیکھے مگر یہ حقیقت ہے کہ جو تین روز ان مخلصین کے ساتھ گزرے وہ میری عمر میں یادگار رہیں گے۔ میری گفتگو جس سے بھی ہوئی اس کا سینہ میں نے اسی قسم کے خلوص اور جذبۂ ایمانی سے بھرپور پایا۔ جو میرے سینے میں کروٹیں لے رہا تھا۔

مولانا منظور نعمانی صاحب۔ علی میاں صاحب (مولانا نعمانی) کی روداد میں علی میاں

کی شرکت بعد میں دکھائی گئی ہے۔ اختیاری صاحب۔ شرفی صاحب اور معلوم نہیں کن کن صاحبان اور مودودی صاحب کے درمیان کچھ ایسے مذاکرات ہوتے رہے جن کا ہمیں علم نہیں (۲۸ شعبان ۱۳۶۰ھ اگست ۱۹۴۱ء) آخر اجتماع عام ہوا اسکی صدارت مودودی صاحب کو سپرد ہوئی اور پہلی تقریر مولانا منظور نعمانی صاحب نے زار وقطار روتے ہوئے کی۔ پورے ہال میں سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص پر رقت طاری تھی۔ اور میں تو کم از کم اتنا مبہوت تھا کہ مجھے مولانا نعمانی کی پوری تقریر بارگاہ ایزدی میں اعتراف جرم، التجائے عفو اور تجدید ایمان سے زیادہ نہ محسوس ہوئی۔

اسی رقت کے عالم میں مولانا منظور صاحب نے اللہ جل شانہٗ سے عہد کے طور پر کلمہ طیبہ پڑھا ان کے بعد دوسروں نے باری باری کلمہ طیبہ کا اعادہ کیا۔ دوسرا شخص میں تھا جس نے اللہ کی بارگاہ میں سر غلامی و بندگی جھکا کر عہد کرنے کی سعی کی۔

ترجمان القرآن میں ہے کہ سب سے پہلے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اٹھے اور کلمہ شہادت اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً رسول اللہ کا اعادہ کیا اور کہا لوگو گواہ رہو کہ میں آج از سر نو ایمان لاتا اور جماعت اسلامی میں شریک ہوتا ہوں۔ اسکے بعد محمد منظور صاحب نعمانی کھڑے ہوئے اور آپ نے بھی مودودی صاحب کی طرح تجدید ایمان کا اعلان کیا۔ بعد ازاں حاضرین میں سے باری باری کرکے ہر شخص اٹھا کلمہ شہادت ادا کیا اور جماعت اسلامی میں شریک ہوا۔ اکثر حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بلکہ بعض لوگوں پر تو روتے روتے رقت طاری ہو گئی تھی ۔۔۔ قریب قریب ہر شخص کلمہ شہادت ادا کرتے وقت ذمہ داری کے احساس سے کانپ رہا تھا۔

(ترجمان القرآن جماعت اسلامی کا پہلا اجتماع ص ۲۱۸ و ص ۲۱۹ جلد اٹھارہ عدد ۴ و ۵ د

اس وقت یہ حالت تھی کہ ہونٹ لرز رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اندرونی جذبات کو روکتے روکتے سینہ اور حلق پھٹے جا رہے تھے۔ جب کلمہ منہ سے کہنا چاہا تو یہ محسوس ہوا کہ ایک بہت بڑا پہاڑ ہے جس کو میں سر پر اٹھا رہا ہوں اور میں اسکے بوجھ سے دب گیا ہوں

اس وقت مودودی صاحب کرسی پر بیٹھے تھے ان کے سامنے ایک چھوٹی سی میز تھی اور وہ بالکل چپ چاپ خاموش اور ساکت بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ ادائگی کلمہ کے وقت جو کیفیت میری تھی قریب قریب، وہی کیفیت دوسرے شرکاء کی تھی۔ اسی اجتماع میں جماعت کا نام "جماعت اسلامی" اس لئے رکھا گیا تھا کہ یہ قادیانیوں کی طرح کوئی فرقہ نہ بن جائے۔ اور یہ کہ ہم لوگ بھی اس فرض کفایہ کی ادائیگی میں تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرینگے۔ اور مسلمانوں سے علحدہ کوئی گروہ نہیں ہوں گے۔

یہ تھی بنیاد جو کچھ مخلصین نے مل کر رکھی تھی اس مجمع میں ایسے لوگ موجود تھے جو اس خطرے سے باخبر تھے کہ اس قسم کی جماعتیں پہلے بھی ہوئی ہیں۔ اور غلط رخ بھی اختیار کرتی رہی ہیں۔ ان لوگوں کے اذہان ہر وقت اسکے لئے تیار رہے۔ کہ اگر اس قسم کی کوئی چیز پائی جائے تو اس سے امیر جماعت کو باخبر رکھا جائے یا پھر سکوت و علحدگی اختیار کرلی جائے۔

اسی اجتماع میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ جماعت کے لوگوں کو تین حیثیتوں میں تقسیم کردیا جائے۔ یعنی درجۂ اول کے رفقاء وہ لوگ جو اپنا سب کچھ اسلام کے لئے وقف کردیں جن میں یہ خادم بھی شامل تھا۔ درجۂ دوم میں وہ رفقاء جو اپنے کو مقام اول تک پہونچانے کی سعی کریں۔ اور کبائر و صغائر سے اجتناب اختیار کریں۔ درجۂ سوم میں وہ رفقاء جو سعی و جہد کرکے دوسرے اور پہلے درجہ میں شامل ہوجائیں۔

کچھ عرصہ بعد یہ صورت بدل دی گئی۔ اور رفقا یا اراکین، متفقین اور ہمدردیہ تین حلقے مقرر ہوگئے۔

دار الاسلام کا قیام اس (تاسیسی) اجتماع کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ کچھ روز کے بعد ہماری پارٹی نے اپنے ارد گرد کی چھاونیوں میں غیر ملکی (انگریز) حکومت کے خلاف بغاوت کی اسکیم مکمل کرکے بم سازی کا انتظام کیا۔ مگر میں چونکہ جماعت سے منسلک ہوچکا تھا۔ اس لئے میں نے یہ ضروری سمجھا

کہ پہلے امیر جماعت سے مشورہ کر لیا جائے، چنانچہ میں لاہور پہونچا اور مودودی صاحب سے اس موضوع پر جنگی حالات کے پیش نظر گفتگو کی مگر مودودی صاحب نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ :-

"یہ وقت ہمارے لئے بیج بونے کا ہے، فصل کاٹنے کا نہیں ہے۔"

اسی ملاقات میں مودودی صاحب سے یہ بھی طے ہوا کہ ہم لوگ دارالاسلام منتقل ہو جائیں گے۔ میں نے دارالاسلام کے قیام کی اسلئے مخالفت کی کہ وہاں کے کارکنان جماعت اپنی معاش کے لئے کوئی آزاد بندوبست نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ ان کو جماعت کی ملازمت اختیار کرنا پڑے گی۔ اور یہ صورت جماعت کے مقصد اصلی میں رکاوٹ ثابت ہوگی کیونکہ ملازمین کو حق گوئی میں تکلف پیش آئے گا۔ (اضافہ - بعد کے تجربات بتاتے ہیں کہ حکیم صاحب موصوف کا یہ اندیشہ بالکل صحیح تھا اور وہی ہو کر رہا۔ چنانچہ کوثر نیازی صاحب نے اپنے طویل شکایتی مکتوب میں اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

جس جماعت کی ——— یہ صورت حال ہو جسکی قیادت اول سے آخر تک تنخواہ دار ہو جس میں اظہار رائے پر قدغن ہو جس میں مٹھی بھر لوگ ووٹ کا حق رکھتے ہوں جس میں آپکی کی پیش کردہ علمی اور دینی آراء سے اختلاف کرنا جماعت کی مخالفت کرنے کے مترادف ہو اس میں ایسا آدمی کیسے داخل ہو سکتا ہے۔ جو خود سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو ———

——————————— جماعت کے دروبست پر قابض بھاری بھاری مشاہرے لینے والے ہمارے بعض رہنما ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے الزامات عائد کرنے اور چغلی و غیبت میں مشغول رہتے ہیں ———

مجھے یقین ہے کہ "گیلانی برادران" اور "کراچی گروپ" وغیرہ کی افسوسناک اصطلاحیں آپ کے کانوں کے لئے بھی اجنبی نہیں ہوں گی۔ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا۔

• ہاں میں ہاں ملانے والے علم دین سے کورے اور عربی زبان سے بالکل نابلد افراد کو جماعت کی

صف اول میں لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہماری تنظیم میں یہ رجحانات ہمارے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ (قومی آواز یکم مارچ ۱۹۶۵ء رومی) مگر مودودی صاحب نے اسی پر زور دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم حالات موجودہ میں کسی بڑے شہر میں یکجائیت حاصل نہیں کر سکیں گے وہاں رہ کر یکسانیت خیال اور اجتماعیت کی فضا ہموار ہوگی۔

میرے اور مودودی صاحب کے درمیان اسی موقع پر یہ بھی طے ہوا کہ جماعت کے نظریات کے تحت جو بچوں کے لئے بنیادی ابتدائی مدرسہ جاری کیا جائے گا میں اس کا نگراں اور استاد ہوں گا۔ مودودی صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "آپ بہر حال مجھ سے وابستہ رہیں گے۔ خواہ مدرسہ قائم ہو سکے یا نہ ہو سکے۔

چنانچہ میں نے وطن پہونچ کر اس اسکیم سے علحدگی اختیار کر لی۔ ان دنوں میں وطن میں مطب ودواخانہ کا کام کر رہا تھا مودودی صاحب کے ایما و اشارہ پر میں نے اپنی مستقل ملازمت سے استعفیٰ دیدیا تھا کہ میں طاغوتی نظام کا پرزہ بن کر رہنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے پرنسپل نے میرا استعفیٰ منظور نہیں کیا۔ ایک سال تک غیر حاضری کے بعد محکمہ نے مجھے عدم حاضری کی بناء پر ملازمت سے سبکدوش کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں غلط اقدام کر رہا ہوں اگر بعد میں مجھے اس کا احساس ہو تو میں ملازمت دوبارہ اختیار کر سکوں گا۔ میں نے قبلہ مودودی صاحب ہی کے ایما پر اپنا دواخانہ اونے پونے ختم کر دیا اور مع اپنی اہلیہ کے "دارالاسلام" پہنچ گیا۔ وہاں مجھ کو مدرسہ مہمان خانہ اور کواپریٹو اسٹور سپرد کر دیا گیا ہم لوگ جون کے مہینے میں دارالاسلام پہنچے تھے۔ وہاں صرف تین گھر مع اہل خانہ کے تھے۔ ایک مودودی صاحب۔ دوسرا میں خود، تیسرے مستری محمد صدیق صاحب باقی حضرات تنہا تھے۔ ان میں غلام علی صاحب بی اے جو مکتبہ کے کلرک مزدور انچارج دفتری وغیرہ سب کچھ تھے۔

رفتہ رفتہ وہاں مولانا منظور نعمانی صاحب، یحییٰ صاحب، قاری عظمت اللہ صاحب

کاتب رسالہ ترجمان القرآن ۔ اقبال صاحب، اعظم ہاشمی صاحب، عبدالعزیز شرقی صاحب مولانا جعفر شاہ صاحب قمرالدین خانصاحب وغیرہ پہنچ گئے۔

مودودی صاحب کے عزائم میں جب تک دارالاسلام میں مودودی صاحب کے ساتھ رہا اس وقت تک ان کے عزائم سے یہ واضح نہیں ہوسکا کہ وہ مجددیت وغیرہ کے خواہشمند ہیں۔ بلکہ یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ سیاسی اقتدار کے آرزومند ضرور ہیں۔ اور ان کے سامنے کوئی مرتب پروگرام موجود ہے جسکو وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے بلکہ پوری جماعت کو اس مقام پر لے جاکر کھڑا کر دینا چاہتے ہیں اور آج وہ چیز بہت حد تک کھل گئی ہے کہ وہ کم از کم اپنے کو ائمہ وقت کی فہرست میں شمار کرانا چاہتے ہیں۔

نفس حدیث پر بھی اعتراض کی اجازت میرے زمانۂ قیام میں عصر کی نماز سے قبل کچھ دیر درس حدیث ہوا کرتا تھا۔ مسند ارشاد پر مودودی صاحب تشریف رکھتے تھے۔ احادیث کو سمجھنے کے لئے اشکال وشکوک سامنے لائے جاتے اور مودودی صاحب اپنی صوابدید کے مطابق ان کو حل کرتے۔ آہستہ آہستہ اس ازالۂ شک نے نفس حدیث پر اعتراض کی صورت اختیار کرلی اور بعض رفقاء خصوصاً نعیم صدیقی صاحب کی طرف سے اعتراض کی نوعیت بدلی ہوئی ہونے لگی۔ حتیٰ کہ ایک روز نعیم صدیقی صاحب نے حدیث پر کچھ اس طرح اعتراضات کئے کہ ان سے نعوذ باللہ منہ تضحیک کا پہلو پیدا ہوتا تھا۔ میں نے اس مسئلہ پر مودودی، صاحب کو توجہ دلائی۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ اس پر غور کرینگے۔ (ناظرین بھی غور فرمالیں کہ یہ شکایت اس فتنہ کا انسداد چاہتی تھی۔ مودودی صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ ایسے لوگوں کو سختی کے ساتھ تنبیہ فرماتے مگر وہاں صرف غور کرنے کا وعدہ فرمالیا گیا۔) اگر یہ صورت ہے تو بہت بری بات ہے۔ مگر انہوں نے اس پر توجہ نہیں کی۔ (جب مودودی صاحب کو ابھی

یہی خبر نہیں تھی کہ انکی محفل درس حدیث میں حدیث کی تضحیک تک ہو جاتی ہے۔ تو وہ اس پر توجہ کیسے کرتے انہیں اپنے مشن کی کامیابی کے لئے ایسی بے خبری بھی ضروری طور پر درکار تھی / دو تین روز انتظار کے بعد جب یہ صورت جاری ہی نظر آئی اور مودودی صاحب نے اس پر نہ ٹوکا تو میرا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا اور میں نے نعیم صدیقی صاحب کو براہ راست سختی کے ساتھ ٹوکا۔ میرے ٹوکنے پر مودودی صاحب نے بھی سرسری طور پر سب کو توجہ دلائی کہ ایسا نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ حدیث پر پہلے ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ اسکے بعد سمجھنے کے لئے اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ (ع "باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی" یہ ایمان بھی خوب ہے کہ پہلے حدیث پر ایمان لے آؤ پھر حدیث سمجھنے کے نام پر چاہے حدیث کی تضحیک کرو مذاق اڑاؤ چاہے اعتراض و انکار کرو جیسے خود علامہ مودودی نے کیا ہے۔ رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۶ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی پیروی میں فرماتے ہیں" یہ کانا دجال وغیرہ تو افسانے ہیں جنکی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے"۔ اسی طرح دوسری جگہ فرماتے ہیں "جہاں تک اسناد کا تعلق ہے ان میں سے اکثر روایات کی سند قوی ہے اور باعتبار روایت اسکی صحت میں کلام نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہوگی (ترجمان القرآن ص ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

مودودی صاحب صرف سنگ میل

میں چونکہ مہمان خانہ کا بھی انچارج تھا اسلئے باہر سے آنے والے اور مودودی صاحب سے ملنے والے حضرات سے مجھے اکثر و بیشتر واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ خصوصاً ان سے جو مہمان خانہ یا لنگر خانہ میں کھانا کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ فلسفہ ایم اے کے ایک نوجوان طالب علم تشریف لائے وہ مودودی صاحب سے ملنے۔ کھانے پر انہوں نے اظہار فرمایا کہ قرآن کو جس طرح اس آخری دور میں مودودی صاحب نے سمجھا اس طرح ابتدائی اسلام سے آج تک کسی

نے نہیں سمجھا تھا۔ میں نے اسکی تردید کی اور ان سے کہا کہ مودودی صاحب کی حیثیت "سنگ میل" سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ راہ وہی پرانی ہے۔ مودودی صاحب اس راہ کی طرف نشاندہی کرنے والے ہیں مگر وہ کچھ اس قدر متاثر تھے کہ تذبذب ہی میں رہے۔ (انھوں نے مودودی صاحب کی کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں سمجھ کر پڑھی ہوگی۔ بھلا وہ کیسے اپنی عقیدت مندی وذہنی غلامی سے دستبردار ہو سکتے تھے۔

قرآن فہمی کا نیا طریقہ

ایک مرتبہ مودودی صاحب اپنے دفتر میں تھے۔ جبکہ ہم دونوں کے درمیان خداوند قدوس واحد و شاہد ہے قرآن کی تفہیم کے سلسلہ میں بات کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن کو پوری طرح سمجھنے کی بہترین صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اس کا خواہشمند پہلے تو یہ سمجھے کہ "الہام" اس پر نازل ہو رہا ہے۔ اور پھر وہ یہ سمجھ کر پڑھے کہ وہ خود اس کلام کو نازل کر رہا ہے۔ اور میں نے (مودودی صاحب) قرآن کو سمجھنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ (دوسرے لفظوں میں اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآن سمجھنے کا خواہشمند پہلے تو اپنے آپ کو "رسول" کی پوزیشن میں تصور کرے اور جب یہ تصور پختہ ہو جائے تو ایک زینہ اور ترقی کر کے نعرہ انا الحق بلند کرے اور مقام قدس پر پہنچ جائے "مگر ایسی بات کوئی صوفی تو شاید کہہ سکے گا علامہ مودودی صاحب کیسے فرما گئے")۔

(اگر آپ کو اس بات کی صحت میں شک ہو۔ تو) اس واقعہ کی صحت کے سلسلے میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چونکہ یہ گفتگو میرے اور مودودی صاحب ہی کے درمیان ہوئی ہے اس لئے میں عرض کر دوں کہ میری دو بیویوں اور پانچ بچوں میں میرے پاس صرف ایک بچہ موجود ہے جسکی عمر چھٹے سال میں ہے اگر میں نے اس گفتگو میں شمہ برابر بھی کوئی تغیر و تبدل کیا ہو تو اللہ جل شانہ مجھے اس بچہ سے محروم فرما دے۔ مرتے وقت ایمان نصیب نہ فرمائے۔ اور قیامت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم قرار دیا جاؤں (حکیم صدیقی صاحب اس مقام پر وفور جذبات میں ایسی قسمیں بھی

کھا گئے جنکی ممانعت ہے۔ جب خدا کو شاہد و گواہ بنا دیا تھا یہی بہت کافی ہے)

مجھ سے کیوں نہیں کہتے

میں چونکہ مودودی کے مزاج سے واقف اور گفتگو میں بے باک تھا اسلئے بعض احباب دارالاسلام نے یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ وہ اپنی ضروریات میرے توسط سے مودودی صاحب تک پہونچاتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ایک صاحب "اخوند توختہ بیگ" نے اپنے کمرے اور سردی کے سامان کے متعلق کہلایا کہ ان کے پاس بالکل کچھ نہیں ہے۔ اور اب ان کو تکلیف ہونے لگی ہے۔ یہ صاحب مودودی صاحب کے گھوڑے تانگے کے نگراں بھی تھے. گھاس لاتے اسکے کھانے پینے کا خیال رکھتے تھے۔ اور مسجد کے "موذن" بھی تھے. اور چند رفقاء کے ہاں پانی بھی بھرا کرتے تھے۔ الحکیم صدیقی نے دارالاسلام کے موذن صاحب کا یہ تعارف بھی خوب کرایا۔ جس موذن کیلئے احادیث نبوی میں فضیلت وارد ہوئی ہے علامہ نے اسے اپنے گھوڑے تانگے کی "سائیسی" کا بھی شرف اعزاز بخش رکھا تھا۔) مگر سوائے پانی کے ایک ایک روپیہ (غالباً فی مکان) ماہانہ معاوضہ کے اور کوئی معاوضہ مقرر نہیں تھا۔ (یعنی موذنی تو خیر لوجہ اللہ تھی ہی، بیچارے "سائیسی" بھی بطور کار خیر ہی انجام دیتے تھے) اس لئے ان کو یہ ضرورت پیش آئی، میں نے جب مودودی صاحب کو ان کا یہ پیغام پہونچایا تو مودودی صاحب اس پر چیں بجبیں ہوئے اور فرمایا کہ آخر یہ لوگ آپ ہی سے کیوں کہتے ہیں مجھ سے براہ راست کیوں نہیں کہتے؟

اہل و عیال کی فکر

ایک مرتبہ میں خلاف معمول اپنے گھر سے نکل کر مودودی صاحب کے دفتر کی جانب سے (دوپہر کے وقت) مسجد جا رہا تھا۔ اس روز مودودی صاحب بھی خلاف معمول اپنے دفتر کے قریب کے درخت کے سایہ میں نہایت متفکر ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے کمر پر ہاتھ رکھ رکھے تھے اور گردن جھکائے ہوئے تھے۔ میں سامنے پہونچا تو میں نے وجہ تفکر دریافت کی۔ پہلے تو انہوں نے ٹالنا چاہا۔ پھر میرے محبانہ اصرار پر فرمایا کہ میں اپنے گھر کے متعلق سوچ رہا ہوں

کہ اس وقت تو میں اہل خانہ کا منہ بھر کر ان کو خاموش کئے ہوئے ہوں مگر جب وہ وقت آئے گا کہ میرے پاس ایک پائی بھی نہ ہوگی۔ تو اس وقت کیا ہوگا۔؟

میں نے اس پر کہا کہ آپ اس وقت کے لئے اس وقت متفکر کیوں ہیں؟ جس خدا نے اس وقت مدد فرمائی وہ اس وقت بھی مدد کریگا۔ اسکے بعد میں نے گفتگو کا رخ بدل دیا اور تھوڑی دیر بعد میں اور مودودی صاحب دفتر میں چلے گئے۔ میں رخصت ہو گیا

پیپر ویٹ کی تصویر ایک مرتبہ میں مودودی صاحب کے دفتر میں پہونچا تو انھوں نے بتایا کہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے نائب ناظم جو اس وقت آموں کی دعوت کے سلسلے میں چودھری نیاز علی صاحب کے مکان پر بطور مہمان تھے۔ مودودی صاحب سے ملنے آرہے ہیں اور وہ ان کے منتظر ہیں۔ میری نگاہ مودودی صاحب کے "پیپر ویٹ" پر پڑی۔ جسکے نیچے کسی یورپین کی تصویر چپکی ہوئی تھی۔ کہ ایک ریٹ کا ٹیلہ ہے اور وہ اس پر چڑھتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ میں نے مودودی صاحب سے کہا کہ آپ کے دفتر میں اس تصویر کا وجود قابل اعتراض تو نہ ہوگا؟ مودودی صاحب نے فرمایا کہ ہاں واقعی آپ نے اچھا کیا کہ اس طرف توجہ دلائی۔ یہ لوگ بہت تنگ خیال (یا شاید تنگ نظر) ہوتے ہیں۔ اس تصویر کو جلدی ان کے پہونچنے سے پہلے ہی کھرچ دیجئے (تصویر کے اس لطیفہ سے علامہ کی "وسعت خیالی" اور خدا ترسی کی جو تصویر کشی ہوتی ہے وہ یقیناً قابل توجہ اور لائق غور ہے؟ لطیفہ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ علامہ اس قسم کی تصویر کا ایسا استعمال واقعتاً جائز سمجھتے تھے۔ اور صرف اہل مدرسہ کی تنگ نظری کے پیش نظر اسے کھرچ دینے کا حکم دیدیا تھا۔ یا موصوف خود بھی اسکو نا جائز سمجھتے تھے؟ بہر حال لطیفہ دلچسپ اور قابل یادگاری ہے)

میری صاف گوئی اور میاں کی علحدگی کی بنیاد میں اپنے زمانۂ قیام میں اس بات پر خاص طور

پر نگاہ رکھتا تھا کہ کہیں قادیانیت کی طرح یہاں بھی کوئی حادثہ نہ پیش آجائے اسلئے اسکے ازالہ کے لئے کوشاں رہتا تھا اور ایسی تمام باتوں یا حالات کی سختی سے تردید کیا کرتا تھا جنہیں اس خدشہ کی طرف لے جاتا محسوس کرتا تھا اور چونکہ میں اسکو دین کی عین خدمت سمجھتا تھا اسلئے بغیر کسی انسانی خوف کے بے دھڑک ہو کر ہر ایک بات کہہ دیا کرتا تھا۔

(ایک زمانہ میں
مولوی اسماعیل موپلا مدراسی جو کچھ دنوں کے لئے دارالاسلام میں قیام پذیر ہوئے تھے) یہ صاحب مودودی صاحب کو میری غیبت میں کافی بدظن کر چکے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو مجھ کو اس پر تعجب ہوا کہ انہوں نے میری غیبت کی اور مودودی صاحب نے اسے سنا مگر میں نے اس کی اس لئے پروا نہیں کی کہ میں صرف اپنے اشد ضروری اخراجات کیلئے زکات و صدقات کی مد سے نہیں بلکہ علی الاعلان مکتبہ کی مد سے بیس روپیہ ماہانہ لیا کرتا تھا اور مجھے اس بیس روپئے کے چھوٹ جانے کا یا چھن جانے کا کبھی ایک مرتبہ بھی خیال پیدا نہیں ہوا۔ کیونکہ میں اس سے کہیں زیادہ آمدنی پر لات مار کر وہاں گیا تھا۔ البتہ بجیلی صاحب کو اپنے معاوضہ کے چھوٹنے اور حضرت شیخ کی نظر سے گرنے کا خطرہ نعیم صاحب اور طفیل محمد صاحب کی طرح ہو سکتا تھا۔

اختلافات اور الزامات

مولانا محمد منظور نعمانی۔ مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواروی۔ سابق امام شاہی مسجد ریاست کپورتھلہ، قمر الدین خانصاحب اور مستری محمد صدیق مرحوم کو جب مودودی صاحب سے اختلاف ہوا تو ان حضرات نے چودہ الزامات کی ایک فہرست پیش کی تھی۔ جسکے سلسلے میں مجلس شوریٰ کا اجلاس دہلی میں ہوا تھا۔ جس میں شمولیت کا شرف مودودی صاحب کی طرفسے اس غلام کو بھی حاصل تھا۔ کوئی صاحب چاہیں تو ان مذکرہ حضرات میں سے کسی صاحب سے اسکی نقل حاصل فرما سکتے ہیں۔ مگر میں اس سلسلے میں کچھ نہیں عرض کروں گا۔ اسلئے کہ

میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں اسکو کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔ اور یہ عدم اظہار کی خواہش مولانا منظور نعمانی صاحب کی تھی۔

جماعت کے لٹریچر کو قرآن اور حدیث پر ترجیح اور اپنا ذہنی غلام بنانے کا خطرناک منصوبہ

دارالاسلام سے چلے آنے کے بعد جب کہ میرا قیام بھاول پور میں تھا۔ تو، مودودی صاحب دارالاسلام سے مدراس کے دورہ کے لئے روانہ ہوئے۔ دہلی پہنچ کر رفقاء جماعت کے اجتماع میں مودودی صاحب نے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ رفقاء جماعت کو جماعت کا لٹریچر زیادہ سے زیادہ اپنے مطالعہ میں رکھنا چاہیئے۔ تاکہ یکجہتی خیال قائم رکھی جا سکے۔ اسکے بعد مدراس پہونچ کر رفقاء کے خصوصی اجتماع میں مودودی صاحب نے انہی الفاظ کا اعادہ فرمایا پھر حیدرآباد پہونچ کر رفقاء کے اجتماع میں مودودی صاحب نے انہی الفاظ کا اعادہ فرمایا یہ سب تقاریر اخبار کوثر کے ذریعہ میرے پاس پہنچیں اور میں اس کا منتظر رہا کہ مودودی صاحب دورہ سے کب دارالاسلام پہنچتے ہیں۔ چنانچہ ان کی واپسی پر میں نے ان کو خط لکھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ آپ نے تین تقاریر میں رفقاء جماعت پر زور دیا کہ وہ جماعت کا لٹریچر زیادہ سے زیادہ پڑھیں۔ مگر قرآن و حدیث کے مطالعہ و علم کا ذکر تک نہ کیا۔ اور جماعت کا لٹریچر اکثر و بیشتر آپ کی تصانیف پر مشتمل ہے گویا آپ اس قوم کے افراد کو جو پہلے ہی پیروں اور فقیروں کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں۔ اپنی ذہنی غلامی میں پھانسنا چاہتے ہیں یہ کیوں ؟

مودودی صاحب نے جواب ارسال فرمایا کہ اس طریق کار سے ذہنی غلامی کے خطرہ کا امکان تو ہے لیکن اگر نہ کیا جائے تو رفقاء میں "ذہنی انارکی" پیدا ہونے کا امکان بھی ہے اور وہ زیادہ خطرناک چیز ہے — میں نے پھر ایک عریضہ جناب مودودی صاحب کی خدمت میں ارسال کیا اور عرض کیا کہ جناب "انارکی" کے پس منظر پر نگاہ ڈالکر دیکھے

انارکی بذاتِ خود کوئی وجود نہیں رکھتی جب تک "منارکی" کا وجود نہ ہو اور اقتدار کامل یا منارکی کے ہوتے ہوئے اسلام انارکی کی محض اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ اسکی تعلیم اور حکم دیتا ہے۔

مودودی صاحب نے بڑے اختصار سے کام لیتے ہوئے جواباً تحریر فرمایا کہ:۔

"میں آپ کو اس مسئلہ پر مطمئن نہ کرسکوں گا۔ آپ کسی اور طرف رجوع فرمائیں"

میں نے پھر کوئی تحریر اس مسئلے میں ارسال نہیں کی۔ اور مضحکہ خیز جواب دیکھکر خاموش ہو گیا کیونکہ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا اور بحث کا سوال ہی نہیں پیدا نہیں ہوتا تھا ____

۔ مودودی صاحب نے اپنے جواب میں یہ یاد نہ رکھا کہ وہ اپنی ہی ذات سے متعلق اعتراض کا جواب ارسال فرما رہے ہیں میں نے ایسے کسی مسئلہ پر کوئی سوال نہیں کیا تھا بلکہ ان کے غلط اقدام کی طرف توجہ دلائی تھی۔ نیز "ذہنی انارکی" کہہ کر انہوں نے مجھے مرعوب کرنے کی غلط سعی فرمائی تھی۔ یہ گویا مجھ پر چوٹ تھی ____ والسلام حکیم شمس الحسن صدیقی

سطور بالا میں جناب حکیم شمس الحسن

ناظرین کے اطمینان مزید کیلئے اضافہ صاحب صدیقی نے علامہ مودودی کو اہل جماعت کیلئے صرف جماعتی لٹریچر پڑھنے کی تاکید پر جو ٹوکا تھا تو ان کا یہ ٹوکنا خلاف حقیقت ہرگز نہ تھا۔ چنانچہ تقریباً اسی بات کی شکایت جماعت اسلامی کشمیر کے ایک رکن جناب مولانا حکیم عبیداللہ خانصاحب نے بھی اپنی کتاب "اسلامی سیاست یا سیاسی اسلام" میں فرمائی ہے۔ موصوف کے یہ تاثرات بھی زیر نظر کتابچہ میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ رسالہ ترجمان القرآن بابت ماہ جون جولائی واگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کے پہلے اجتماع کی روداد شائع ہوئی ہے۔ اس روداد میں بھی علامہ مودودی نے ۲ شعبان کو اجتماع عام میں حاضرین کو جو ہدایات دی ہیں۔ ان میں ہدایت ۱۰ میں یہ ارشاد فرمائی گئی ہے:۔

(۴) جو شخص جماعت میں داخل ہو اس کو تحریک اسلامی کے لٹریچر کا بیشتر حصہ پڑھوا دیا جائے تاکہ وہ اس تحریک کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو جائے اور تحریک کے ارکان میں ذہنی و عملی ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اس معاملہ میں بھی کسی کے متعلق یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ وہ تو پہلے ہی سے سب کچھ سمجھتا ہوگا۔ اگر اس مفروضہ پر ایسے لوگوں کی بڑی تعداد جماعت میں داخل کر لی گئی جو اس تحریک کے لٹریچر پر نظر نہ رکھتے ہوں تو اندیشہ ہے کہ جماعت کے ارکان ایک دوسرے سے متضاد باتیں اور متضاد حرکات کرینگے۔

(ترجمان القرآن ص ۲۳۷ بابت جون، جولائی، اگست)

ان حالات میں یہ خطرہ یقینی ہے کہ وہ لوگ جن کا دینی ذہن صرف جماعت کے لٹریچر سے تیار ہوگا جس میں حضرات انبیاء کرام اور صحابہ عظام ائمہ دین و علماء اسلام پر بے دریغ اور بے دھڑک تنقیدیں موجود ہیں۔ قرآن کی بنیادی اصطلاحوں کی ایک نئی سیاست آمیز تفسیریں ہیں) تو نتیجہ وہی ہوگا جس کا اندیشہ حکیم صدیقی صاحب نے اوپر ظاہر کیا اور جماعت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ کہ ایسے لوگ اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہوں یا نہوں علامہ کی ذہنی غلامی میں ضرور مبتلا ہو جائینگے۔ اور علامہ کے مندرجہ بالا جواب سے بھی یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو گئی کہ وہ "ذہنی انارکی" کا "ہوّا" دکھا کر اپنی جماعت کو اپنی ذہنی غلامی میں رکھنا بھی چاہتے ہیں۔ یعنی دستور جماعت کی وہ بنیادی دفعہ کہ "رسول خدا کے سوا کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہو"۔ شاید خود علامہ پر لاگو نہ ہوتی ہوگی۔ اور علامہ کے نزدیک اہل جماعت کو "ذہنی انارکی" سے بچنے کے لئے اسکے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے کہ وہ موصوف کی ذہنی غلامی کا قلادہ اپنی اپنی گردنوں میں ڈالے رہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ بیتی نمبر ۲

جماعت اسلامی کے بارے میں

ہمارا موقف

از۔ جناب حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب۔ مدیر المنبر لائلپور (پاکستان)

(منقول از المنبر مورخہ ۴ر اکتوبر ۱۹۵۸ء)

"المنبر" آج سے ڈیڑھ دو سال پہلے جماعت اسلامی کا سرگرم حامی تھا۔ اس زمانہ میں المنبر نے اپنی بساط کے مطابق جماعت کی دعوت کو عام کرنے۔ جماعت کی مخالفتوں کے دفاع جماعت کے بارے میں غلط فہمیوں کے ازالے اور جماعت کے کارکنوں کو روح دین و تقویٰ کی جانب متوجہ کرنے میں جو کام کیا اس سے قارئین المنبر کا ہر طبقہ آگاہ ہے۔ اس مدت کے آخر میں ایک مختصر سا زمانہ ایسا آیا کہ "المنبر" نے جماعت کے نظم میں منسلک اور جماعت کی امارتوں کے ماتحت ہونے کے باوجود جماعت کے بعض اہم اندرونی معاملات پر کنایتہً بحث کی۔ اور آخرالامر وہ مرحلہ آ گیا کہ جب "ادارہ المنبر جماعت کی ابتدائی رکنیت سے مستعفی ہو گیا"۔ اس علیحدگی کے بعد "المنبر" نے عام روش سے ہٹ کر ایک نئے طرز اختلاف کی طرح ڈالی۔ اور خالص اصولی انداز سے ان مباحث کو جماعت کے اندر اور باہر کے حلقوں کے سامنے رکھا جو اس کے نزدیک اس لائق تھے کہ ان پر توجہ دی جائے — یہ سلسلہ ایک عرصہ تک اسی انداز سے چلتا رہا — لیکن اب کچھ دنوں سے ان صفحات میں تصریح و وضاحت کے ساتھ لیکن غیر مربوط سلسلہ شروع ہے جس میں جماعت سے اختلاف اور جماعت کے بعض اقدامات پر تنقید کی جاتی ہے۔

"المنبر" کے ان چاروں ادوار میں قارئین (المنبر) کے تاثرات ہم تک پہنچتے رہے
، اور اسی مدت میں ہمارے پاس ملک کے ہر حصے سے بے شمار استفسارات اور
والات بھی آئے ہیں۔ کہ اپنی علیحدگی کی وجوہ پر روشنی ڈالیں اور ان حالات و
جاب کو پیش کریں۔ جو جماعت میں اس انتشار کی وجہ بنے ہیں جسکی کوئی توقع نہ جماعت
، ہی خواہوں کو تھی اور نہ دشمنوں کو۔

ہم نے ان چاروں ادوار میں جو کچھ کیا اور کہا ہم اپنی تمام کوتاہیوں غلطیوں
کمزوریوں کے کامل اعتراف کے باوجود یقین رکھتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب اور آقا کے
خود اپنے لکھے ہوئے مقالات اور مضامین پر جواب دہ ہونا ہے۔ اسی طرح ہم
کسی لمحہ اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا۔ کہ ہم عند اللہ اور عند الناس اس امر کے
ف ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کی بہبود اور مصلحت کو پیش نظر رکھیں اور کوئی ایسا
م اور اظہار خیال نہ کریں جس سے اللہ کے دین کو یا مسلمانوں کو نقصان پہونچے۔

یہ تیسری حقیقت بھی ہمیشہ ہمارے سامنے رہی ہے کہ پاکستان میں الحاد
اسلام کی جو شدید کشمکش سالہا سال سے جاری ہے ہم نے کبھی بھی اسے نظر انداز
کرنا ہے۔ اور ہر وقت یہ لحاظ رکھنا ہے کہ ہماری کسی بات سے اس کشمکش
اسلام کو ضعف نہ پہونچے۔

ان چہار گونہ تحفظات کو اپنی آخری حد استطاعت تک ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے یہ طویل
گذارا ہے۔ اور دل کے بھیدوں سے "علیم وخبیر" گواہ ہے کہ ہم نے تنہائیوں میں اس پر
ہے۔ اپنے آقا کے حضور میں راہ راست پر چلنے کی التجائیں کی ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ جب
نہ گار اور سیہ کار کو اول مرتبہ اپنے رب کے گھر میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی
تو گڑگڑا کر اس سے دعائیں کی ہیں۔ کہ وہ اس خاص مسئلہ میں راہ نمائی فرمائے اور
اندھیرے میں جو ان شدید اختلافات کی وجہ سے چارسو پھیلا ہوا ہے ہمارا ہاتھ پکڑ کر

"صراط مستقیم پر لے چلے۔
ہم نے اسی سلسلہ میں ان دوستوں اور بزرگوں سے مشورے بھی کئے ہیں جنکو ہم نے علم اور تقویٰ اور اسلام سے محبت میں اپنے سے فائق محسوس کیا۔

ایک طرف ہماری یہ مساعی اور کاوشیں اور ان کے نتیجے میں یہ طرز عمل ہے۔ جو ہم نے اختیار کیا۔ اور دوسری طرف بعض احباب اور مخلصین کی وہ آراء ہیں جو ہمارے اختیار کردہ طریق کار کی مخالفت میں ہم تک پہنچتی رہی ہیں۔

ہم نے ذاتی حد تک ان دونوں باہم متضاد باتوں پر بار بار خالی الذہن ہو کر غور کیا۔ اور اسی نتیجہ تک پہنچے کہ ہمیں جماعت سے اپنے اختلافات کو واضح کر دینا چاہیئے۔ لیکن ایک تو اس لئے کہ ہم نے آج تک کوئی باقاعدہ سلسلہ شروع کر کے اپنی باتوں کو پیش نہیں کیا۔ جسکی وجہ سے ہمارے اختلافات کی بنیادیں سب کے سامنے نہیں آئیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے متعلق جو غلط فہمیاں ذمہ دارانہ جماعت کی طرف سے مسلسل اور پیہم پھیلائی گئی ہیں ہم نے آج تک ان سے تعرض نہیں کیا۔ اور ان کا جواب دیتے ہوئے صحیح صورت حال سامنے نہیں رکھی۔ ان دونوں وجوہ کے باعث مخلصین کی ایک تعداد ہے جو بار بار اپنے مخلصانہ اضطراب کا اظہار کرتی ہے۔

ہم نے اس صورت حال پر غور کرنے کے بعد آج اس امر کا فیصلہ کیا ہے کہ ہم صفائی کے ساتھ اس مسئلہ کو جیسا کہ وہ ہمارے سامنے ہے۔ مخلص دوستوں کے سامنے رکھدیں اور انہیں زحمت دیں کہ وہ اپنی آراء سے بلا کم و کاست ہمیں مطلع فرمائیں ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم نہ تو کسی دلیل کو اسلئے رد کرینگے کہ وہ ہماری رائے کے خلاف ہے اور نہ ہی کسی لمحہ اس ذمہ داری کو فراموش کر کے فیصلہ کرینگے جو ایک مسلمان ——— اور اسکے ساتھ ساتھ ایک اخبار کے مدیر کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتی ہے۔

مسئلہ کی حقیقی نوعیت

اس مسئلہ کی حقیقی نوعیت یہ ہے کہ راقم نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

پہلا مرحلہ صاحب کے خیالات کو ۱۹۳۹ء میں اجمالاً سنا۔ اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس ملاقات میں تشفی نہیں ہوئی۔ اور یہ رائے قائم ہوئی کہ مولانا جس "طریق نبوت" پر چلنے کی دوسروں کو دعوت دیتے ہیں۔ نہ تو اس طریق کے "نشیب و فراز" پر وہ ہنوز غور کر پائے ہیں نہ ان کا اپنا مزاج مزاج نبوت سے ہم آہنگ ہے۔ اور نہ ہی ان کی عملی زندگی ایسی ہے کہ وہ اس طریق پر دوسروں کو لے چلنے والے قائد کی حیثیت اختیار کر سکیں —— —— اس رائے کے قائم ہوتے ہی اس ملاقات میں راقم اور اسکے بعض ساتھیوں نے ممدوح سے چند سوالات کئے۔ انہوں نے بعض کوتاہیوں کا اعتراف کیا۔ بعض عذرات پیش کئے۔ خصوصاً اس عذر کو بڑی اہمیت دی کہ وہ خود بھی ایک دوسری زندگی سے اس کوچہ کی طرف آئے ہیں۔ اور ان کا اندرون خانہ ماحول اب بھی دوسری دنیا کو اپنائے ہوئے ہے اسلئے بعض پہلوؤں میں وہ پیچھے ہیں۔ لیکن وہ اس کا شعور بھی رکھتے ہیں اور ان کا عزم بھی یہی ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں گے —— البتہ وہ فطری تبدیلی کے قائل ہیں اور اسی کے مطابق اپنے آپ اور اپنے ماحول کو ڈھالیں گے۔

راقم نے ان کی اس آخری بات پر اعتماد کیا —— اور اسی وقت سے یہ معمول بن گیا کہ مولانا کی باتوں پر غور بھی کیا جائے۔ اور ان کو ایک دوسرے تک پہونچایا جائے۔

یہ زمانہ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک رہا۔

دوسرا مرحلہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک کے عرصہ میں ممدوح نے بعض اہم دینی و سیاسی عنوانات پر معرکہ کی باتیں کہیں۔ ان میں سے اکثر دل و دماغ کو اپیل کرتی تھیں۔ اور بعض سے اختلاف بھی شدید تھا۔ لیکن یہ طے کر لیا گیا کہ بحیثیت مجموعی چونکہ ان تحریروں سے فائدہ حاصل

کیا جاسکتا ہے۔ اسلئے ان کی اشاعت کرنی دین کی خدمت ہے لیکن جماعت میں شرکت اسلئے نہ کی کہ ایک نوجوان سے ۱۹۳۹ء کی پہلی ملاقات میں قائم ہوئی تھی وہ ہنوز موجود تھی۔ دوسرے بعض اہم مسائل میں مولانا سے اختلاف تھا اور ان مسائل پر مولانا سے گفتگو میں اور مراسلت بھی رہا کرتی تھی۔

اسی عرصہ میں راقم کو "جماعت اسلامی" کے "سبعہ موسسین"ؑ میں سے ایک بزرگ مستری محمد صدیق صاحب سے شرف تعارف حاصل ہوا۔ یہ بزرگ جماعت سے علحدہ ہو چکے تھے۔ لیکن علحدگی کے وجوہ کو ظاہر نہ کرنے میں اسقدر متشدد تھے کہ غالباً کوئی بھی شخص ان سے یہ راز پانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

اسی دوران (۱۹۴۵ء) مولانا محمد منظور نعمانی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ممدوح نے تفصیلات بتانے سے قطعی گریز کیا۔ اور صرف اشارۃً یہ فرمایا کہ

وہ نہ تو اقامت دین کی جد وجہد کو تصنیف وتالیف کا ادارہ سمجھتے ہیں اور نہ اس دعوے کے خلاف سیرتوں کو برداشت کر سکتے ہیں۔

—— لیکن جب راقم نے ان سے اس موضوع پر گفتگو کی کہ اس غلطی کے انسداد پر وہ آغاز کار میں تو قدرت رکھتے تھے انہیں اس مرکز کو (بقول ان کے) صرف مصنفوں اور ادیبوں کے ہاتھوں میں چھوڑ کر وہاں سے چلے نہیں جانا چاہئے تھا تو انہوں نے غالباً تفصیلات میں جانے سے گریز کی خاطر یہ کہہ کر سلسلہ گفتگو ختم کر دیا کہ

"ہاں اس کا احساس ہوا ہے کہ اگر ہم لوگ وہاں جمے رہتے تو شاید حالات بہتر ہوجاتے"

اس عرصہ تیسرے صاحب جو ملے وہ مولانا محمد جعفر صاحب پھلواری تھے۔ انہوں نے بھی "راز" بتانے سے "گریز ہی کو ترجیح دی اور صرف ان اشارات پر اکتفا کیا کہ

"خدا کے دین کو قائم کرنے کا کام کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اسکے لئے جس قسم

ؑ سبعہ کے معنی سات اور موسسین سے مراد وہ حضرات جو جماعت کی تاسیس کے وقت موجود تھے۔ (رومی)

کے "دل" کی ضرورت ہے وہ اگر نہ ہو تو ہر آنے والا بھٹکنے پر مجبور ہو گا"۔

ایک طرف یہ اصحاب تھے ــــــــ اور دوسری جانب بعض بزرگ وہ تھے جو جماعت کی صف اول میں تھے۔ ان میں سے سب زیادہ قرب محب مکرم مولانا مسعود عالم ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رہا۔ ان سے اندازہ ہوا کہ جماعت کے اندر بھی بعض ذی علم اور اصحاب تجربہ ایسے ہیں جو ان باتوں کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ جو مزاج نبوت کے خلاف پائی جاتی ہیں۔ اور ان مسائل میں بھی اختلافات رکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً مولانا مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں ــــــــ اور یہ کہ یہ اختلاف رائے اور احساس اس اجتماعیت کے مزاج کے خلاف نہیں ہے۔ مزید برآں یہ کہ اصلاح احوال کی امید غالب ہے۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ جماعت اسلامی کی اصولی دعوت کے

تیسرا مرحلہ شباب کا زمانہ ہے۔ اسی مدت میں مولانا کے خیالات کا مثبت حصہ زیادہ وضاحت سے سامنے آیا۔ اس حصہ میں چند اہم باتوں (مثلاً مظاہر تقوی، حجیت حدیث درایت و روایت سنت کی تعریف، سلف پر تنقید، کفر بالطاغوت، وغیرہ) سے شدید اختلاف رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس زمانہ (یعنی ۱۹۴۵ء و ۱۹۵۰ء کے مابین) میں محترم محمد عبد الجبار غازی صاحب سے تعارف کا شرف حاصل ہوا اور ان کے خیالات کی تفصیل سامنے آنے سے یہ تاثر قائم ہوا کہ جماعت میں اگر چار آدمی "بڑوں" کی تعریف میں آتے ہیں۔ (راقم عبد الرحیم اشرف) کے نزدیک مولانا مودودی۔ مولانا اصلاحی۔ مولانا مسعود عالم اور غازی صاحبان ہی جماعت کے بڑے آدمی شمار ہوتے تھے۔) تو ان کے دینی رجحانات، ان کے سیاسی افکار اور انکے مابین اختلافات کی نوعیت ایسی ہے کہ یہاں کسی ایک فکر کے کلی غلبہ کا امکان کم سے کم ہے۔ اور یہ جماعت کسر و انکسار کے بعد کسی ایک معتدل

طریق پر چل کر منزلِ مقصود تک پہونچ سکتی ہے۔

چوتھا مرحلہ

اسکے بعد ملک تقسیم ہوا اور خون کے دریاؤں میں "غوطہ زنی" کے بعد پاکستان میں سانس لینا نصیب ہوا۔ یہاں آن کر حالات نئے تھے۔ مسائل کی نوعیت پہلے سے بڑی حد تک مختلف تھی۔ اور پچھلے دور کی تمام آراء مضمحل محسوس ہوتی تھیں۔

اور رکنیت کا فیصلہ

۱۹۴۸ء ہی ہے کہ راقم نے اس بناء پر رکنیت کا فیصلہ کیا کہ اس ملک میں کوئی دوسری جماعت ایسی موجود نہیں جو دین کے اجتماعی اور انفرادی دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر مصروفِ جدوجہد ہو۔ ۱۹۴۹ء میں پہلی مرتبہ مرکزی شوریٰ میں شمولیت کا موقع ملا۔ مولانا مودودی صاحب اور مولانا اصلاحی صاحب ان دنوں جیل میں تھے۔ ان کے عرصۂ اسارت (زمانۂ قید) میں جن مجالس شوریٰ میں شرکت کی گئی ان سے جو چند حقیقتیں واضح ہوئیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ:۔

انکشاف حقیقت

"جماعت کے ذی علم اور اصحاب تجربہ میں اختلاف تو پائے جاتے ہیں۔ لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ جماعت کی پالیسی طے ہوتی ہے مولانا مودودی صاحب کی رائے کے مطابق۔

حد تو یہ ہے کہ مولانا کی عدم موجودگی میں جو پالیسی طے کی جا رہی ہے۔ اس میں بھی نوے فی صد دخل مولانا مودودی صاحب کے ان احکامات اور فیصلوں کا ہے جو ممدوح جیل سے بھیج رہے ہیں۔"

دوسرے مرحلہ میں یہ ہر دو حضرات جیل سے باہر آ گئے۔ انتخابات کا زمانہ سر پہ آ چکا تھا۔ یہ جنگ "شہادت حق" کے فلسفہ کے تحت لڑی گئی۔ اور اسکے بعد ۱۹۵۱ء کی

شوریٰ میں پہلی مرتبہ جماعت کے چاروں ذی علم حضرات کے رجحانات و افکار کا صحیح اندازہ ہوا۔ اس سے بیک وقت دو احساس ہوئے۔

ایک تو یہ کہ ان حضرات کے مابین اختلافات بڑے گہرے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ اگرچہ جماعت بڑی حد تک مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب کی مٹھی میں ہی ہے۔ لیکن اگر دوسرے حضرات اپنی اہم ذمہ داری کا صحیح احساس کرتے ہوئے کسی بات پر جم جائیں، تو دلائل کے اعتبار سے ان کا پلہ بھاری ہوتا ہے۔ اور شخصیتوں کے اساس پر وہ ایسی پالیسی وضع کرا سکتے ہیں۔ جو قریب باعتدال ہو۔

سنہ ۱۹۵۱ء سے سنہ ۱۹۵۳ء تک کا

حیرانی و بے اطمینانی اور اختلاف کا آغاز زمانہ اس طرح گذرا کہ بنیادی اختلافات نے مستقبل کے اندیشوں کی شکل اختیار کرلی اور مرکزی شوریٰ میں دو نقطہ ہائے نظر بڑی حد تک نمایاں نظر آنے لگے۔ اور اس بات کو بار بار محسوس کیا جانے لگا کہ :- " جماعت بتدریج اس " نقطۂ اعتدال " سے ہٹ رہی ہے جس پر قائم ہوئی تھی۔ اور جو اس کا " امتیاز خاص " بھی تھا۔"

اس زمانہ میں بعض شدید تلخیاں بھی رونما ہوئیں۔

خامیوں کی نشاندہی یہ تلخیاں خصوصیت سے حسب ذیل عنوانات پر سامنے آئیں۔

۱۔ انتخابات کی راہ میں پڑ کر جماعت ان بنیادی کاموں کو نظر انداز کر رہی ہے۔ جس کے لیے دراصل جماعت قائم ہوئی تھی۔ اور جس کے بغیر اسلام کے عملاً قیام کا امکان ہی نہیں۔

۲۔ جماعت کے اندر عمل صالح اور روح تقویٰ مضمحل ہو رہی ہے۔

۳۔ جماعت " اسلام " کو عالمی نظریہ قرار دیکر جس تصور انقلاب کو لے کر اٹھی تھی وہ مغلوب ہو رہا ہے۔ اور جماعت پر ایسے عناصر چھا رہے ہیں جو " اسلام " کو نیشن (قومی مذہب)

سمجھتے ہیں۔ اور خطرہ ہے کہ یہ حضرات جماعت کو نامطلوب مقام پر پہونچا دینگے۔

۴ ۔ جماعت میں شورائیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور اہم امور بلا مشورہ شوریٰ طے ہو جاتے ہیں۔

۵ ۔ جماعت کے بعض اہل قلم اور ادیب حضرات اپنے سے اختلاف رکھنے والے ارکان مرکزی شوریٰ کے خلاف جماعتی اخبارات و رسائل میں پست انداز تحریر اختیار کرتے ہیں اور شورائیت کے خلاف اپنے نقطۂ نظر کو جماعت پر ٹھونس رہے ہیں۔

۶ ۔ جماعت کو اپنے طریق کار کے بارے میں دو ٹوک موقف اختیار کرنا چاہیئے۔ اس وقت وہ "اسلامی حکومت کسطرح قائم ہوتی ہے ؟" میں پیش کردہ طریق کار (افراد کی اصلاح سے اسلامی معاشرہ اور اس معاشرہ سے فطری طریق پر اسلامی حکومت وجود میں آئے۔) اور مسلم لیگ کے قبل از تقسیم طریق کار (اولاً حصول اقتدار اور پھر اقتدار کے ذریعہ اصلاحی مقاصد کی تکمیل) کے مابین لڑھک رہی ہے۔ اس بارے میں یکسو ہو جانا چاہیئے۔

۷ ۔ جماعت کے اکثر اصحاب قلم دینی جماعتوں کی مخالفتوں میں حد اعتدال سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ اور بتدریج یہ خطرہ شدت اختیار کر رہا ہے کہ جماعت ایک مذہبی فرقہ بن کر رہ جائے گی۔

۸ ۔ جماعت کے ذمہ دار حضرات ارباب اختیار کو اپنا حریف قرار دے رہے ہیں۔ اور ان سے اسی طرح لڑائی لڑ رہے ہیں۔ جس طرح سیاسی حریف سے لڑا کرتے ہیں۔ اور نتیجۃً جماعت کا داعیانہ مقام نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے۔ اور کارکنوں کا مزاج بھی غیر مطلوب مزاج بن رہا ہے۔

۹ ۔ جماعت کے بعض اصحاب قلم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی مدح سرائی میں خوشامد سے آگے بڑھ کر شخصیت پرستی کے مقام پر پہنچ رہے ہیں۔ اور جماعت ون مین شو (ONE MAN Show) کے خطرہ سے دوچار ہے۔

۱۰ - قرارداد مقاصد کی بنیاد پر پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دینا درست نہ تھا اس غلط فیصلہ کی وجہ سے جماعت کا انداز فکر بری طرح بدل رہا ہے۔

۱۱ - جماعت کے مالی معاملات اضطراب انگیز حد تک خراب ہو چکے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے بعض اہم مسائل تھے جن پر تقریباً ہر شوریٰ میں اختلافات ابھرتے تھے ــــ لیکن ملک میں قادیانی مسئلہ نے اضطراب انگیز شکل اختیار کر لی - اور ــــ بالآخر جماعت کے ذمہ دار حضرات جیلوں میں محبوس ہو گئے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں جماعت ایک دوسرے دور میں داخل ہو گئی اور دستور کے مسئلہ نے شدید سے شدید نوعیت اختیار کر لی ـــــ لیکن ان اصولی اور بنیادی اختلافات کی شدت کا یہ عالم تھا کہ اس زمانہ کی مجالس شوریٰ بھی ان سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

آخر الامر سنہ ۵۶ء کے اواخر میں جب سالانہ اجتماع ہونے والا تھا تو ارکان جماعت نے اجتماع عام کیلئے ایسے اہم سوالات بھیجے جو جماعت کی بنیادی پالیسی جماعت کے اصولی موقف، جماعت کے طریق کار جماعت کے مزاج جماعت کے نظم جماعت میں شورائیت انتخابات غرضیکہ ہر اہم مسئلہ سے متعلق تھے اور ان سے جماعت کے اندرونی اضطراب کا صحیح اندازہ ہوتا تھا۔

یہ بات یقینی ہے کہ اگر یہ مسائل اس اجتماع میں زیر بحث آتے تو یہی اجتماع "ماچھی گوٹھ" کا اجتماع ثابت ہوتا ـــــ لیکن مجلس شوریٰ نے ان اختلافات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ راہ تجویز کی کہ یہ سوالات ایک کمیٹی کے سپرد کر دیئے جائیں۔ اور اسے مامور کیا جائے کہ وہ جماعت کے ارکان کی صحیح رائے ان بنیادی مسائل کے بارے میں معلوم کرے۔

جائزہ کمیٹی

یہاں سے وہ دور شروع ہوتا ہے جسے "جائزہ کمیٹی" کا زمانہ کہنا چاہیے اور جو بالآخر جماعت کے انتشار کا باعث بنا اس دور کے تمام واقعات کو حذف کرتے ہوئے اس آخری حصہ کو بیان کرنا ضروری ہے کہ

اور استعفاء

راقم نے جس دن جماعت کو چھوڑا ہے اس روز جماعت کی مرکزی مجلس عاملہ

کے تین اہم ترین ارکان مجلس عاملہ کی طرف سے مامور تھے کہ وہ اس موضوع پر گفتگو کریں"
اس وفد کے ایک واجب الاحترام بزرگ نے سوال کیا کہ
کیا تمہارے نزدیک جماعت پر غلبہ شر ہے۔ یا

جماعت میں شر کا غلبہ ہے

خیر غالب ہے؟ راقم نے عرض کیا کہ "میرے نزدیک جماعت (اور اسی طرح تمام دوسری جماعتیں) نہ کبھی خیر محض تھی اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ لیکن ایک عرصہ تک تو جماعت پر خیر کا غلبہ رہا۔ اور شر مغلوب تھا لیکن بتدریج نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ اب شر غالب آچکا ہے۔ اور خیر مغلوب ہے۔ (میں نے کبھی جماعت میں خیر کے وجود کا انکار نہیں کیا اور آج بھی صاف صاف اظہار کرتا ہوں کہ جماعت میں بعض پہلو خیر کے پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعض کام فی الحقیقت مفید ہیں لیکن جماعت اکیلی اس میں ممتاز نہیں ہر جماعت میں کوئی نہ کوئی پہلو خیر کا موجود ہوتا ہے۔)

میں نے مزید کہا — کہ میں اسکے باوجود جماعت کے اندر رہنے کو ترجیح دے سکتا تھا اور خیر کو غالب کرنے میں کوشاں رہ سکتا تھا۔ لیکن اب نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ

(الف) جو لوگ میرے نزدیک غلبۂ خیر کے علمبردار تھے

دین میں تحریف

انھیں جماعت کے امراء اور ان کے ساتھیوں نے بالکلیہ شل کر دیا ہے اور وہ نہ صرف یہ کہ یہ کام نہیں کر سکتے الٹا وہ مجبور ہیں کہ جماعت میں ذمیوں کی حیثیت اختیار کریں۔

(ب) جماعت کے اندر شر پھیلانے والوں نے اس زمانہ (جائزہ کمیٹی کے تقرر سے اگست سنہ ۱۹۵۶ء تک) میں ایسے جرائم کا ارتکاب کیا ہے جن کو امیر جماعت نے بھی جرم قرار دیا ہے لیکن غلبۂ شر کی کیفیت کا یہ عالم ہے کہ وہ مسلسل وعدوں کے باوجود ان جرائم کو روک نہیں سکے۔

(ج) اس غلبۂ شر کو ختم کرنے اور خیر کو غالب کرنے کیلئے جتنے جمہوری اور اصلاحی طریقے دستور کی رو سے ممکن تھے وہ ایک ایک کر کے ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اور اب دستور اس نوع کا بنا دیا گیا ہے کہ اصلاح کی کوئی شکل باقی نہیں رہی۔

(د) خود اس وفد کے ذمہ داروں سے ایک نہایت احتیاط کے ساتھ غالباً دس تک گن کر بتایا گیا کہ ـــــ وعدے کئے گئے لیکن ان سے ایک وعدہ بھی پورا نہیں ہوا (اس وفد نے اس کا اعتراف کیا۔)

(ھ) اب جماعت نے ایک ایسا فلسفہ پیش کیا ہے جو جماعت کی بنیادی دعوت کے اصولوں کی نفی کے مترادف ہے۔ اور اس فلسفہ کیلئے ایک جدید سلسلہ عقائد بھی پیش کر دیا ہے۔ جو بجائے خود دین کی تحریف کے مترادف ہے اور اگر کوئی شخص اسے تحریف دین سمجھنے کے باوجود اسلئے خاموش رہے کہ وہ اس جماعت کا رکن ہے۔ جس کے امیر نے یہ عقیدہ پیش کیا ہے۔ تو میں اسے معصیت سمجھتا ہوں اور اسے لے کر نہیں چل سکتا۔

یہ میرا مشاہدہ ہے جس کے حق ہونے پر میں یقین رکھتا ہوں لیکن میں کھلے دل کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ اگر آپ حضرات مجھے یہ سمجھا دیں کہ تمہارا موقف غلط ہے۔

ـــــ اور آخر درجہ یہ کہ جماعت کے اندر جن خرابیوں کو آپ تینوں حضرات تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان کی اصلاح کی کوشش کے باوجود آپ آج تک کامیاب نہیں ہو سکے آپ اگر امکان عقلی کی حد تک ہی یہ ثابت کر دیں کہ اب ان خرابیوں کے ازالہ پر قدرت حاصل کر سکیں گے۔ تو میں رکنیت سے مستعفی ہونے کے فیصلہ کو روک لیتا ہوں۔

اس گذارش پر ان تین حضرات میں سے ایک محترم بھائی نے ذاتی اپیل کی کہ میں چھ ماہ تک مزید انتظار کروں۔ لیکن دوسرے بزرگ نے میرے بولنے سے پہلے فرمایا کہ دلائل کے جواب میں جذباتی اپیل کا کوئی معنی نہیں۔"

آخر کار جب میں اور میرے ساتھ اس سفر میں شریک دو اور رفیقوں (مصطفےٰ صادق

صاحب و میاں فضل احمد صاحب) نے استعفیٰ لکھ لئے اور لاہور اسٹیشن پر میں نے اپنا استعفیٰ محترم چودھری غلام محمد صاحب کے سپرد کر دیا تو اس قدیم رفیق کے آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ مجھے پہلے ہی اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے انتہائی رقت کی حالت میں اپنے قدیم ساتھیوں سے عرض کیا ـــــ آپ حضرات کا صدمہ تو صرف یہ ہے کہ آپ کا ایک ساتھی یا چند ساتھی مر گئے لیکن خدائے بصیر و علیم گواہ ہے میری کیفیت یہ ہے کہ آج میرے لئے پوری دنیا مر گئی ہے۔ میں نے جماعت اسلامی کو اپنی جان، اپنے اعزہ، اپنے اقارب اور اپنے احباب سے زیادہ عزیز جانا تھا۔ یہ زندگی کا واحد سہارا تھی۔ اس سے دین کی تمام آرزوئیں وابستہ تھیں۔ میرے نزدیک یہ نعمت سو سال کے بعد مسلمانوں کو میسر آئی تھی۔ میرا سہارا یہ تھا کہ خدا کے دین کو قائم کرنے کی ایک نیکی ہی اتنی بڑی نیکی ہے کہ مالک یوم الدین سے اسکے صدقے تمام اعمال بد کی مغفرت کی درخواست کی جا سکتی ہے۔ آج یہ سہارا ٹوٹ گیا۔ آج میرے دل کی حالت

بالاکوٹ کے بعد دوسرا سانحہ

یہ ہے کہ میں صرف یہی نہیں سمجھتا کہ جماعت اپنے مقصد سے منحرف ہو گئی۔ بلکہ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کہ بالاکوٹ کے حادثہ کے بعد یہ دوسرا سانحہ برپا ہوا ہے کہ

"جماعت اسلامی قتل ہو گئی اور یہ صدمہ الم انگیز ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہوں کہ اس کا قتل ان ہاتھوں سے ہوا ہے جو اسکی پرورش کے ذمہ دار تھے

چودھری صاحب! آج یہاں سے اس حال میں روانہ ہو رہا ہوں کہ پندرہ سال جن دوستوں کیلئے سب سے چومکھی لڑائی لڑی تھی آج ان سے ہاتھ دھو رہا ہوں گویا زندگی کی بساط ہی الٹ گئی اور آج اس پودے کا اجتماعی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ جسکے لئے اعزہ و اقارب تک کو نظر انداز کر رکھا تھا۔"

اس قسم کے جذبات و تاثرات تھے جب اس قافلہ سے انقطاع کیا تھا جو خدا کے دین کو قائم کرنے اور سنت نبوی کو زندہ کرنے کا عہد کر کے چلا تھا لیکن میرے علم و یقین کی حد تک اس نے اس غلط راستے پر سفر شروع کر دیا تھا۔ جسے اس نے جاہلیت کی راہ اور طریق نبوت کے بالمقابل پگڈنڈی قرار دیا تھا۔

اسکے بعد میں نے دیانتہً محسوس کیا کہ اگر میں جماعت کے نظم میں رہ کر جماعت کی اصلاح میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اب باہر نکل کر جماعت کا نام لئے بغیر ایک اصولی بحث کے ذریعہ جماعت کے اہل علم کو صورت حال کی جانب توجہ دلائی جائے۔ تاکہ ان کے اندر اگر قبول حق کی استعداد موجود ہو تو ہر قسم کے اشتعال اور غصے کے بغیر کہی ہوئی اصولی بات سے اپنے موقف کی غلطی محسوس کر لیں۔ چنانچہ میں نے ان صفحات میں "مطلوب جماعت" کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا۔

فیصلہ کن احساسات

"یہ پس منظر" قدرے طویل ہو گیا۔ مقصد یہ تھا کہ جن بزرگوں، دوستوں اور اصحاب فہم سے مشورہ مطلوب ہے ان کو صورتحال سے تا بحد امکان مطلع کر دیا جائے۔ اب صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اسوقت میرے احساسات کیا ہیں جنکی بناء پر مجھے یہ فیصلہ کرنا ہے۔ کہ جہاں تک اخبار کے صفحات کا تعلق ہے جماعت کے متعلق کیا پالیسی اختیار کی جائے۔ مجھے جماعت اسلامی کے موجودہ موقف سے بعض اہم اندیشے ہیں۔ جو بالاجمال حسب ذیل ہیں:-

دین کا محور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ جماعت نے اپنے ابتدائی دور میں جو بلند دعاوی کیے تھے مثلاً یہ کہ وہ اس دنیا میں واحد جماعت ہے۔ جو دین کے جامع تصور کی حامی ہے (اس دعوے میں جماعت کے موجودہ قائدین میں سے بعض نے مسلسل یہ کہا اور لکھا ہے کہ

اسلام کا صحیح تصور اور فہم سوا ہزار سال سے معدوم تھا۔ اور اسے مولانا مودودی صاحب نے اب پیش کیا ہے۔)

- یہ وہ واحد جماعت ہے جو طریق نبوت کے مطابق انقلاب برپا کرے گی۔
- اس جماعت کا عظیم تر مقصد یہ ہے کہ موجودہ زاہدوں سے زیادہ بہتر زاہد اور موجودہ سیاستدانوں سے زیادہ بلند ذہن سیاستداں پیدا کرے۔
- یہ جماعت پورے کے پورے دین کی علمبردار ہے۔ اور اس کا ہر قدم کتاب وسنت کے منشا کی تعبیر ہے۔ (بالفاظ دیگر عام لوگوں کے لئے جماعت کے فیصلے اور اقدامات "اسلام" کی حیثیت رکھتے ہیں۔)
- خلافت راشدہ کے بعد یہ وہ پہلی جماعت ہے جو تجدید واحیائے دین کے فریضہ کو ان غلطیوں سے مبرا جدوجہد کے ذریعہ ادا کرنا چاہتی ہے۔ جو عمر بن عبدالعزیز سے سید احمد شہید علیہم الرحمہ تک کے مجددین سے سرزد ہوتی رہی ہیں (ملاحظہ ہو "تجدید واحیائے دین" میں علامہ مودودی فرما چکے ہیں۔" اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہوتے مگر وہ کامیاب نہ ہوئے —— مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔)

ان دعاوی کی اس قدر تشہیر کی گئی ہے کہ وہ مسلمان جو براہ راست کتاب وسنت سے واقف نہیں ہے (اور دوسرے علمائے دین ومصلحین امت کی تصانیف بھی دیکھنے کو نہیں ملی ہیں۔) وہ صرف اسی جماعت کو دین کا محور خیال کررہے ہیں۔ اور ان کا یہ احساس عقیدے کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ کہ جماعت سے اختلاف ایک سنگین جرم ہے۔ اور اس سے براہ راست دین کو نقصان پہنچتا ہے۔

اور میرا مشاہدہ بالکلیہ اس کے خلاف ہے۔ میں اس جماعت کو نہ صرف یہ کہ ان تمام دعاوی کے اعتبار سے غلط ادعا کی حامل خیال کرتا ہوں بلکہ یہ بات میرے نزدیک سب سے بڑا حق ہے۔ کہ یہ جماعت بحیثیت مجموعی ملک کی بعض دوسری نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتوں

کے ہم پایہ ہے۔ اگر اس میں بعض خوبیاں ان سے زائد ہیں تو بعض پہلوؤں میں یہ ان سے کمزور اور تہی دامن بھی ہے۔ اور یہ بات بھی میرے نزدیک یقین کی حیثیت حاصل کر چکی ہے کہ جماعت دین اور سیاست کے جس مجموعے کو اپنا رہی ہے یہ بتدریج ختم ہو کر رہے گا۔ اور اور جماعت اس مقام پر پہنچنا ہی چاہتی ہے جب اسکے اپنے پیش کردہ لٹریچر اور اسکے عمل کا تضاد اتنا واضح ہو جائے گا کہ اسے اپنی ہستی کو محفوظ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

میرے نزدیک اس امر کا کوئی امکان نہیں کہ یہ جماعت تا دیر اس صورت حال کو باقی رکھ سکے کہ ایک شخص کو پڑھائے تو "اسلام کا نظریہ سیاسی" "شہادت حق" اور "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟" اور جماعت کی ابتدائی روداد یں اور لے جا کر کھڑا کر دے اس انتخابی مہم میں جسکے باطل ہونے پر ان کتابوں کی ایک ایک سطر شاہد ہو۔

اس تضاد کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جماعت اپنی دینی حیثیت کو کھودیگی ——— اس وقت ان لوگوں کے صدمہ کی جو حالت ہوگی اس کا اندازہ ہر صاحب بصیرت کو ہونا چاہئے جو جماعت کو دین کا محور خیال کئے ہوئے ہیں۔

اور مجھے صرف ان کے صدمے ہی کا احساس نہیں میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ وہ آئندہ دین کے نام پر اٹھنے والی ہر دعوت سے فرار اختیار کرنے لگیں گے۔

اسلام پر عدم اعتماد

دوسرا اہم خطرہ میرے سامنے یہ ہے کہ لوگ جب اس صریح تضاد کو دیکھیں گے تو ان کا ضعیف ایمان انھیں اس نتیجے پر پہونچائے گا کہ اگر جماعت نے اسلام اور طریق نبوت کو ہی پیش کیا تھا۔ اور وہ اسی پر باین ہمہ ادعا و سعی و جہد نہیں چل سکی تو اس کا معنی یہ ہے کہ اسلام قابل عمل ہی نہیں ہے ——— اور یہ عدم اعتماد جن ہلاکتوں کو اپنے ساتھ لائے گا ان کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔

اسلام کی کتر بیونت

میں اس خطرہ کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں کہ جماعت کے داعی تک اب اس مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ

وہ سیاست کے موجودہ مدوجزر کے مطابق اسلام کی ایسی تعبیریں کریں جنکی پرزور تردید وہ خود اپنے ابتدائی دور میں کرچکے ہیں اور اس طرح وہ الحاد اور انکار سنت و مخالفت احادیث نبویہ کو ایسی تقویت بہم پہونچادیں۔ جسکی تلافی کے لئے ایک عظیم جدوجہد کی ضرورت ہو۔ (اگر اس میں کسی کو شک ہو تو وہ مولانا مودودی صاحب کے حکمت عملی والے مضمون، منتخبہ کے بارے میں اظہار خیال انتخابی پالیسی ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۶ء میں اور ان دونوں کو اسلام ثابت کرنے کی مساعی پر انکار حدیث کے علمبرداروں کی تحریریں اور تبصرے پڑھ کر صورت حال کا اندازہ کرسکتا ہے)

روح سے معریٰ اسلام

مولانا مودودی صاحب نے "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" اور قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" سے جس اسلام کی دعوت کا آغاز کیا تھا وہ اب [illegible] ایسے اسلام کی شکل میں سامنے ہے جس کی روح تعلق باللہ، اللہ کی نصرت و تائید۔ ایمان بالغیب اللہ تعالیٰ کی عبادات میں انہماک تقویٰ کی حقیقت کو پانے کی اساسات پر مبنی نہیں بلکہ اس کی حقیقی روح اسلام کے سیاسی نظام کو قائم کرنا ہے۔ اور جماعت کے اندر اصل قیمت صرف اس چیز کی ہے۔ کہ پروپیگنڈے نشر و اشاعت مخالفین کی سرکوبی اخبارات میں نمایاں ہونے دوسروں سے گٹھ جوڑ کرنے کی صلاحیت کس قدر زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہے؟ ——

—— اور میں یقین رکھتا ہوں کہ اس روح سے معریٰ اسلام، اشتراکیت تو بڑی قوت ہے۔ کسی بھی معمولی مادی قوت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اور نہ ہی کسی دوسرے عقلی نظریہ کے بالمقابل فائق ہوسکتا ہے —— اسلام کی قوت کا راز اس یقین میں ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول پر مومن کو حاصل ہوتا ہے۔

لمحۂ فکریہ

میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ان قدروں پر ابھرنے والا اسلام جس نوع کے کارکنوں اور مسلمانوں کی تخلیق کریگا وہ ایک ایسی مخلوق ہوگی جس سے جماعت کے موجودہ ارکان کی اکثریت بھی پناہ مانگے گی —— لیکن جماعت

کا وہ "اجتماعی مزاج" جسے اب ایک عرصہ سے اصل معیار قرار دیا جا رہا ہے۔ اور اسی مخلوق کو اپنائے گا اور اس سے اسلام کے بارے میں ایک عجیب تصور ابھرے گا۔ جس کو اصل اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔

فلسفہ میکاوُلی یا اسلام

میں جماعت کی دس سالہ تاریخ بالعموم اور ۵۶ء تا ۵۸ء کے جماعتی فیصلوں، اقدامات، پالیسیوں اور مولانا مودودی صاحب کے ان رجحانات کی روشنی میں خصوصاً (جن کا بڑا حصہ ہنوز ارکان جماعت سے بھی مخفی ہے۔) اس خطرے کو بھی حقیقت کی شکل اختیار کرتے دیکھ رہا ہوں۔ کہ جماعت عملاً اس عقیدہ کو اپنا رہی ہے۔ کہ اصل چیز نصب العین کی پاکیزگی ہے ——

رہا طریق کار اور وسائل تو وہ چونکہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اس لئے ان میں اگر کچھ اجزاء باطل، جھوٹ، فریب، فساد انگیزی اور اسلام کی عام تعلیمات کی رو سے ناجائز باتوں کے بھی شامل ہو جائیں تو نہیں بوقت ضرورت اختیار کیا جا سکتا ہے بالفاظ دیگر جماعت جس • فلسفۂ میکاولی کے استیصال کے لئے اٹھی تھی وہی اس کا محور فکر و عمل بن کر رہے۔

اسی پر اکتفا نہیں —— میں جماعت کے قائدین کا موقف یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ان تمام باتوں کے جواز کیلئے قرآن اور حدیث سے استدلال کریں۔ اور اپنی ہر غلطی کو اسوۂ رسالت سے سند جواز عطا کریں۔ میرے نزدیک اس سے اسلام کی دعوت میں ایسی ایسی رکاوٹیں پیدا ہوں گی جنکو دور کرنے کے لئے ایک طویل جدوجہد درکار ہو گی۔

استبداد مطلق

میں نے جس چیز کو کئی سال تک ابھرتے پنپتے بار آور ہوتے، اور بالآخر جماعت پر غالب ہوتے دیکھا ہے۔ وہ ہے استبداد مطلق —— یہ استبداد سیاسی بھی ہے اور علمی بھی۔ دینی بھی ہے اور معاشی بھی —— میں اس استبداد کو جمہوری دنیا میں ناقابل عمل سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے سر اٹھانے اسکے چھا جانے اور وقتی طور پر اس کے ہلاکت خیز ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا

ـــــــــ میرے علم و مشاہدہ میں مولانا مودودی صاحب ایک مستبد مطلق قائد (ڈکٹیٹر) سیاسی لیڈر کی حیثیت رکھتے ہیں ـــــــ اور جب یہ صورت اقامت دین کے نام پر ہو اور اسکو اپنانے والی ایک جماعت ہو تو اس سے پیدا ہونے والے خطرات سے کوئی ذی ہوش شخص انکار نہیں کر سکتا۔

سیاسی اندیشے یہ تمام عنوانات خالص دینی موضوعات سے متعلق ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کا مقام دین کو براہ راست نقصان پہونچانے والے امور کا ہے ـــــــــ ان کے علاوہ ایک اہم باب سیاسی اندیشوں کا ہے۔ لیکن چونکہ جماعت اسلامی ہی اس باب میں منفرد نہیں ہے۔ پاکستان کی اکثر جماعتیں بالعموم ایسے اقدامات کرتی رہتی ہیں جن سے پاکستان اور ملت اسلامیہ کو ذہنی اخلاقی، سماجی اور سیاسی نقصانات پہنچتے رہتے ہیں۔ اسلئے ہم ان امور کو اہم سمجھنے کے باوجود ان کو اپنے فیصلے کا مدار نہیں ٹھہراتے۔ اور یہاں ان کا ذکر ضروری محسوس نہیں ہوتا۔

ایک عظیم المیہ میرے احساسات کی تفصیل کا یہ حصہ بھی انتہائی اجمال کے باوجود طویل ہوا جا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کوئی صاحب اس اظہار کو دیکھ کر یہ رائے قائم کریں کہ یہ تمام باتیں بس جوش یا لڑائی کے موڈ میں مبتلا انسان کی حیثیت سے کی جا رہی ہیں۔

قسم ہے اس عظیم و برتر خدائے پاک کی جسکے قبضہ میں میری جان ہے اور اس کے حضور کل مجھے بھی تمام انسانوں کی طرح اپنے اعمال و افعال کا جواب دہ ہونا ہے اپنے ان احساسات کو ایک ٹیس۔ درد اور کرب کی طرح محسوس کر رہا ہوں یہ احساسات اگر محض ظن و تخمین کی بنیاد پر مبنی ہوتے اور ان کی حیثیت مستقبل کے اندیشوں ہی کی ہوتی تو میں معوذات پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیتا۔ اور ہمیشہ کے لئے اس داستان کو لپیٹ کر رکھ

میرے اس اضطراب کا باعث یہ ہے کہ اوپر جتنے عنوانات پر میں نے چند کلمات لکھے ہیں۔ ان کی پشت پر شواہد، تجربات، حقائق، واقعات تحریروں کا ایسا ریکارڈ ہے جسکی تفصیل اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں صفحات پر مشتمل ضرور ہے ——— اور میں جب یہ دیکھتا ہوں کہ "اقامت دین" کے بلند تر فرض کی ادائیگی کے لیے قائم ہونے والی اس جماعت کی یہ جد وجہد ناکامی پر منتج ہوئی ہے۔ اور اسکے اسباب پر اتنے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اس کے پرجوش و مخلص کارکن تک بھی ان سے آگاہ نہیں ہیں ——— تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مورخ جب اس ناکامی پر بحث کریگا تو وہ اندھیرے میں "ٹامک ٹوئیاں" ماریگا اور عام مسلمان اصل اسلام اور اسکے پہنچنے کی صلاحیت سے مایوس ہوں گے۔ اور آئندہ ایک مدت تک اس مقدس جد وجہد کے لئے ماحول ناسازگار ہو جائے گا تو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں اپنی معلومات کو سب کے سامنے رکھدوں۔

میں ہی کیوں یہ کام کروں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علیحدہ ہونے والوں میں سے اکیلا میں ہی کیوں یہ کام انجام دوں ؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے اس وقت تک اپنے تمام مشاہدات و خطرات کا تذکرہ جس ذی علم بزرگ، متقی، عالم، مخلص وذی فہم کارکن سے کیا ان سب نے ان کی تائید بھی کی ہے۔ اور ان کی شدت کا احساس بھی کیا ہے ———

——— اب اگر میں اس تلخ فرض کو پورا کرنے میں پہل کر رہا ہوں تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک چھوٹا سا آدمی کسی اہم بات کا آغاز کرتا ہے۔ اور بعد میں اس کام کی واقعی صلاحیت رکھنے والے لوگ آکر اسے تکمیل تک پہونچا دیتے ہیں۔

ضروری وضاحت

یہ بات واضح رہے کہ میرا ہدف "جماعت اسلامی" ہرگز نہیں ہے ——— میں خدائے تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس جماعت کے کارکنوں کو میں علم، تقوی، دینی جوش، دین سے محبت اور دین کی اصلی تعلیمات کو محفوظ رکھنے کے احساس میں اپنے سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں ——— میرا اصلی مدعا صرف یہ ہے کہ اسلام ان خطرات سے محفوظ رہے۔ جو میرے نزدیک جماعت کے بعض بااثر رہنماؤں کی غلط کاریوں سے اسے لاحق ہیں وبس۔

جو حضرات اس بات کے حق میں نہیں ہیں کہ جماعت پر تنقید کی جائے جب تک ان کے سامنے ان خطرات کے دلائل نہ پیش کئے جائیں۔ جو اوپر عرض کئے گئے ہیں۔ ان کے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ انھیں صحیح یا غلط قرار دے سکیں ——— لیکن ان کے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ وہ راقم کی اس رائے کو غلط ثابت کریں کہ ان خطرات کے احساس اور ان خطرات کو مبنی بر صحت ثابت کرنے والے مشاہدات و واقعات کے باوجود تم شرعاً مکلف نہیں ہو کہ یہ کام کرو ——— میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اپنے وقت کو اپنی حد تک قیمتی سمجھتا ہوں ——— اگر یہ کام دین کی خدمت نہیں ہے تو خدائے لایزال کی قسم میں اس میں لمحہ ضائع کرنا بھی اللہ کی امانتوں میں خیانت سمجھتا ہوں ——— اور میں اس کے لئے ہرگز ہرگز تیار نہیں۔

اور میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے جو کچھ سوچا اور آج تک اظہار خیال کیا ہے اس میں کسی جوش اور غصہ کو قطعاً دخل نہیں ———
اگر کسی بات پر میرا نفس آمادہ انتقام ہو سکتا تھا تو یہ باتیں آج سے ڈیڑھ سال پہلے پوری شدت سے شروع ہو چکی تھیں۔ میں اس وقت غصہ میں آسکتا تھا۔

جب لاہور کے اجتماع ارکان میں عبد الجبار غازی صاحب کو امریکہ کا ایجنٹ، سعید ملک صاحب کو گورمانی کا دلال۔ مولانا اصلاحی صاحب کو سعید ملک صاحب سے رشوت لینے والے شیخ سلطان احمد صاحب کو سعید ملک صاحب سے تحائف قبول کرنے والے اور راقم کو امریکہ سے مدد لے کر "المنبر" چلانے والا کہا گیا تھا ـــــــ میں اس وقت مشتعل ہو سکتا تھا۔ جب مولانا مودودی صاحب نے ان سب کو ضعیف الارادہ۔ جہل مرکب کے مریض، فتنہ پسند جماعت میں انتشار پیدا کرنے والا افراد بکہ جماعت کو نصیحت کی تھی کہ ان لوگوں کو جماعت کے سامنے ذلیل کرو ـــــــ اس وقت میری آتش انتقام بھڑک سکتی تھی۔ جب امیر حلقہ لائل پور نے مجھے ذلیل کرنے کے لئے بدترین پروپیگنڈے کی مہم میرے اور میرے بعض ساتھیوں کے خلاف چلائی تھی اور بالآخر مجھے اور مرکزی شوریٰ کے رکن چودھری عبد الحمید صاحب کو رکنیت سے معطل کر کے رسوا کرنے کی کوشش کی تھی ـــــــ

ـــــــ میں اس وقت اناپ شناپ کہہ سکتا تھا۔ جب میرے کاروبار اور معاش کو تباہ کرنے کی ایک خطرناک اسکیم جماعت کے شعبہ محنت کاراں نے بنائی تھی۔ اور مجھے مقدمات میں الجھا کر پریشان کرنے کی کوشش کی تھی۔

ـــــــ میں اس وقت اشتعال میں آ سکتا تھا جب مولانا مودودی صاحب نے کراچی سے پشاور تک کے اجتماعات میں "جائزہ کمیٹی" کے ارکان بالخصوص اسکے کنوینر (راقم الحروف عبد الرحیم اشرف) کو سازشی اور بددیانت ثابت کرنے کی مہم کا آغاز فرمایا تھا۔ ـــــــ

ـــــــ یہ اور اس قسم کے مواقع رونما ہوئے اور بیت گئے۔ اور ان میں سے ہر اقدام پر اللہ رب العزت نے

صبر و استقامت کی توفیق عنایت فرمائی ——— اب جبکہ یہ پروپیگنڈے جاری رہنے کے باوجود بے حقیقت ثابت ہو چکے ہیں۔ تو مجھے کسی نفسانیت کی بناء پر اس کام کو کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔

اگر کوئی اللہ کا بندہ مجھے دلائل سے یہ سمجھا دے کہ میرے ان احساسات و مشاہدات کے باوجود مجھے یہ معلومات شائع نہیں کرنی چاہئیں تو تا زندگی ان کا احسان مند رہوں گا۔ اور آج کے بعد ایک حرف اس المناک داستان کا صفحہ قرطاس پر نہیں لاؤں گا۔

اللھم ارنی الحق حقا وارزقنی اتباعہ وارنی الباطل باطلا وارزقنی اجتنابہ

(المنبر۔ لائلپور مورخہ ۶ ۲/۵۸)

بسمِ اللہِ الرّحمٰن الرّحیم

آپ بیتی ـــ تحریکِ جماعت اسلامی

(دورِ اول اور دورِ ثانی میں تضاد)

ایک تحقیقی مطالعہ

(از :- جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (سابق رکن جماعت اسلامی پاکستان)

آئندہ سطور میں جناب ڈاکٹر صاحب موصوف کی موسومہ بالا تالیف سے اختصار و تلخیص کرتے ہوئے خود ڈاکٹر صاحب کے ہی الفاظ و عبارات میں کچھ ایسے حقائق و تجربات پیش کئے جا رہے ہیں جو موصوف کے ذاتی تجربہ و مشاہدہ سے متعلق ہونے کی بناء پر "آپ بیتی کے ذیل میں آسکتے ہیں۔

موصوف کے اس بیان سے یہ اندازہ لگایا جا سکے گا کہ انہوں نے اپنی ایمانی و رُوحانی تشنگی کی تسکین کیلئے "تحریک جماعت اسلامی" جیسی تنظیم و تحریک کو "آب خنک شیریں" کا چشمہ سمجھکر اس سے اپنی پیاس بجھانی چاہی تھی۔ لیکن انجام کار دیکھتے ہی دیکھتے کسطرح وہ چشمہ "مجسم سراب" اور تودۂ ریت بن گیا اور موصوف کی وہ تشنگی دور نہ ہو سکی۔

موصوف کی یہ کتاب دو سو پینتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ کتاب کے ضروری و اہم اجزاء کی تلخیص خود انھیں کے الفاظ و عبارات ہی میں پیش کر دوں۔ ملاحظہ ہو۔

تلخیص دیباچہ

(صہ پر دیباچہ کی ابتدا یوں فرماتے ہیں) "پیش نظر تحریر دراصل ایک بیان ہے، جو بحیثیت رکن جماعت اسلامی راقم الحروف نے اکتوبر ۱۹۵۶ء میں "جائزہ کمیٹی" کی خدمت میں پیش کیا تھا۔" (صہ پر) "یہ مجلس ابتداء آٹھ ارکان پر مشتمل تھی لیکن چند ماہ بعد بعض وجوہات کی بناء پر اسکو مختصر کر دیا گیا۔ اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کی سرکردگی میں ان کے علاوہ مرکزی مجلس شوریٰ کے تین اور بزرگ اراکین یعنی مولانا عبدالجبار غازی صاحب، مولانا عبدالغفار حسن صاحب اور جناب شیخ سلطان احمد صاحب پر مشتمل اس جائزہ کمیٹی نے تقریباً آٹھ ماہ کے عرصہ میں پورے پاکستان کا دورہ کر کے اپنے فرائض مفوضہ کو ادا کیا۔ اور نومبر ۱۹۵۶ء میں ایک رپورٹ مرکزی مجلس شوریٰ کی خدمت میں پیش کر دی۔ یہی وہ جائزہ کمیٹی تھی جس کی خدمت میں پیش نظر بیان پیش کیا گیا۔" (صہ پر) "آج سے تقریباً دس سال قبل کی ایک تحریر کو اشاعت عام کیلئے پیش کرتے ہوئے اس سوال کا جواب فطری طور پر میرے ذمہ ہے۔ کہ آج تک میں نے اس کو کیوں شائع نہ کیا اور اب کیوں کر رہا ہوں"۔

"اب سے پہلے اس تحریر کو شائع نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگرچہ یہ تحریر برصغیر ہند و پاک کی ایک معروف دینی و سیاسی جماعت کے بارے میں ایک تاریخی مطالعہ ہونے کے اعتبار سے عمومی دلچسپی کی حامل بھی ہے۔ لیکن اس کے اصل مخاطب جماعت اسلامی کے متعلقین ہی ہیں اور جماعت کے حلقے میں متذکرہ بالا جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے کے فوراً بعد جو ہنگامی صورت حال پیدا ہوئی جسکے نتیجہ میں صرف پوری جائزہ کمیٹی کے (چہار افراد) بلکہ مولانا امین احسن اصلاحی اور کم و بیش پچاس ساٹھ ارکان جماعت، جماعت سے علٰحدہ ہوئے اور پھر الزامات اور ان کے جوابات کا جو تلخ سلسلہ شروع ہوا اس نے جماعت کی اندرونی اور اسکے قریب کی فضا کو اس درجہ مکدر کر دیا تھا کہ اس میں اس بات کا سرے سے کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا کہ کسی

بھی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جا سکے۔

(صے کے حاشیہ پر ہنگامی صورت حال کی وضاحت فرماتے ہوئے) "اس ہنگامی صورت حال کی مختصر تشریح کیلئے میں اپنی رکنیت جماعت سے استعفیٰ کے حسب ذیل الفاظ نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں

"جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے لے کر اجتماع "کاچھی گوٹھ" تک جماعت اسلامی پاکستان کے حلقوں میں جن ناخوشگوار اور کریہہ واقعات کا چکر چلا ہے ان کو محض یاد کرنے ہی سے انسان کو سخت اذیت اور کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پندرہ روزہ شوریٰ کے دوران جس میں رپورٹ پر غور ہو۔ شوریٰ کے فعال عناصر کا دو متقابل اور متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جانا، بہت رد و قدح کے بعد اور بالآخر خوف انتشار کی بنا پر بالاکراہ کسر و انکسار کے ذریعے ایک "لایعنی اور مہمل قرارداد" کا پاس ہونا پھر اس کی مختلف توجیہیں اور جماعت کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف ردعمل اسکے نتیجہ کے طور پر سازشوں کی برملا تہمتیں، اکابرین جماعت کا ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی گری ہوئی رایوں کا اظہار، سید ملک صاحب کا سنسنی خیز استعفا۔ اور اس کا اسی انداز میں قیم جماعت (جو اب امیر جماعت ہیں) کی طرف سے تعاقب امیر جماعت (علامہ مودودی) کا جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان پر نجوی گروہ بندی (خفیہ گروہ بندی) اور "غیر شعوری سازش کا الزام"، مولانا امین احسن صاحب صاحب کا استعفیٰ از رکنیت جماعت، امیر جماعت کا جذباتی انداز میں (غالباً اخلاقی دباؤ ڈالنے کیلئے) استعفا از امارت جماعت، جماعت کے اندر ایک مہم کے انداز میں امیر جماعت پر قرارداد ہائے جماعت، مولانا عبدالغفار صاحب کا استعفا از مناصب جماعت۔ سلطان احمد صاحب کا استعفا از رکنیت شوریٰ

ـــــ یہ سارے معاملات میرے لئے اس اعتبار سے غیر متوقع نہ تھے کہ میری نو

رائے ہی یہ تھی کہ اب جماعت ایک خالص سیاسی جماعت بن گئی ہے۔ اور یہ اسکے ناگزیر ثمرات ہیں لیکن اس لحاظ سے کمر توڑ دینے والے تھے کہ جماعت میں اخلاقی تنزل اور گراوٹ کے بارے میں اتنی پست رائے میں نے ابھی قائم نہیں کی تھی۔ ________"

(ص ۹ پر) ادھر دو تین سال سے فضا قدرے پرسکون ہوئی ہے ____ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نکلنے والے" اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے ہیں اور "رہنے والے" اپنے مسائل میں مشغول اور اگرچہ اب بھی طنز و تعریض کے اکا دکا تیر چلتے رہتے ہیں ________ تاہم یہ سب کچھ اب "الشاذ کالمعدوم" کے حکم میں ہے ورنہ عام طور پر فضا میں وہ تکدر باقی نہیں رہا جو کبھی تھا اور نتیجتہً اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ جماعت سے متعلق حضرات میری اس تحریر کو کسی قدر کھلے دل سے پڑھ سکیں گے"

دیباچہ کا خاتمہ

"اس تحریر کو ختم کرتے ہوئے میں اپنے رکنیت جماعت سے استعفا کے آخری دو پیرے نقل کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ آج اس تحریک کی اشاعت سے پھر شاید میرے کچھ بزرگ اور دوست اس طرح دل گرفتہ ہوں جیسے میرے مستعفی ہونے کے وقت ہوئے تھے ________ اسی وقت اس سلسلے میں میں نے اپنے جن جذبات کا اظہار کیا تھا آج بھی میرے جذبات وہی ہیں۔

"جماعت اسلامی کے ساتھ میرا جذباتی اور غیر شعوری تعلق ۱۹۴۲ء سے شعوری ہمدردی کا تعلق ۱۹۴۵ء سے (جب کہ میں نے جماعت کی رکنیت اختیار کی) اور باقاعدہ رکنیت کا تعلق گذشتہ سوا سال سے ہے۔ اس دس سال کے عرصہ میں میری پوری دنیا جماعت ہی کے چھوٹے سے حلقے میں محدود رہی۔ تعلقات اور دوستیاں محبتیں اور الفتیں حتیٰ کہ رشتہ داریاں تک اسی حلقے میں محدود ہیں۔ بیٹھنا اٹھنا بھی اسی میں رہا۔ اور ہنسنا بولنا بھی اسی میں رہا ________ اب دفعتہً اس حلقے سے نکلتے ہوئے دل و دماغ سخت صدمہ محسوس کر رہے ہیں۔ کتنے ہی بزرگوں سے مجھے والہانہ عقیدت ہے

اور کتنے ہی ساتھیوں سے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں سوچتا ہوں آج کے بعد شاید میرے بزرگ میری عقیدت کی قدر نہ کریں۔ اور میرے دوست میری محبت پر اعتماد نہ کریں تو دل اندر سے پکڑا سا جاتا ہے۔ پھر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات کو مجروح کروں گا۔ تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے ـــــــ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لئے آمادہ ہوگیا ہوں کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا!"

میں نے جب جماعت کی رکنیت اختیار کی تھی تو اس وقت بھی اسے کوئی بچوں کا کھیل نہیں سمجھا تھا۔ اور آج جبکہ اسے ترک کر رہا ہوں تو یہ اقدام بھی بغیر سوچ بچار کے کسی جذباتی کیفیت میں نہیں کر رہا۔

اپنے "بیان جائزہ کمیٹی" کے تحریر کرنے کے ایک سال قبل سے میں ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں اور اس واقعہ کو بھی آج چھ ماہ سے اوپر کا عرصہ ہو چکا ہے جس میں میں نے جذبات سے خالی ذہن کے ساتھ بھی اور جذبات کی رفاقت کے ساتھ بھی دونوں ہی طرح مسلسل غور کیا ہے۔ اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعا کرتے ہوئے ایک فیصلہ کیا ہے۔ جب (جماعت کے) اندر آیا تھا۔ تو "رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا" کے ساتھ "رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ" کی دعا کرتا ہوا آیا تھا۔ اور آج جب باہر جا رہا ہوں تو اپنے اللہ سے "وَاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ" کی دعا کرتا ہوا جا رہا ہوں ـــــــ

ـــــــ جن حالات اور کیفیات سے گذر کر میں نے جماعت کی رکنیت سے تعلق منقطع کیا ہے۔ وہ میں نے اپنی حد تک صحیح اور صاف صاف بیان کر دیئے ہیں۔ اسکے بعد بھی کسی "نفسیاتی تجزیے" کی ضرورت ہو تو جماعت کے کئی اہل قلم کو

ماشاء اللہ اس میں مہارت تامہ حاصل ہی ہے۔" (ص ۲۲ تا ص ۲۴)۔ (کتاب کے دیباچہ کے بعد چند صفحات میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے ابتدائی حالات مختصر طور پر تحریر فرمائے ہیں جس میں جماعت سے اپنی وابستگی و تعلق کا حال قدرے تفصیل سے تحریر فرمایا ہے۔ مختصراً اسکی تلخیص بھی ملاحظہ ہو)

(ص ۳۱ پر) "کچھ اپنے بارے میں" کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

میری زندگی کے مختلف ادوار حسب ذیل ہیں:۔

(الف) پیدائش (اپریل سنہ ۳۲ء) سے میٹرک پاس کرنے تک (سنہ ۱۹۴۷ء) کا زمانہ میں نے ضلع حصار مشرقی پنجاب میں گذارا۔ ظاہر بات ہے کہ جماعت اسلامی کا قیام اور اسکی زندگی کے اولین سال تو میری بالکل بے شعوری اور ناسمجھی کا زمانہ تھا ـــــ تاہم اسی زمانہ ہی میں میرے کان میں جماعت اسلامی کی دعوت پڑ چکی تھی۔ (ص ۳۱)

(ب) حصار سے لاہور آتے ہی یعنی قیام پاکستان کے فوراً بعد میں نے بھی جماعت اسلامی کے لٹریچر کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور جماعت لاہور کے حلقہ کرشن نگر کے ساتھ عملاً وابستہ ہو گیا۔ جناب ماسٹر شہاب الدین صاحب جو ابھی تک کرشن نگر لاہور ہی میں مقیم ہیں ہمارے حلقہ کے ناظم تھے ـــــ اس زمانہ میں ـــــ میں نے انتھک کام کیا۔ یہ زمانہ جماعت کے مطالعہ اول کی مہم کا زمانہ تھا اور میں نے اس زمانے میں پوری سرگرمی کے ساتھ کام کیا تھا ـــــ

ـــــ لیکن تحریک کے ساتھ میرا یہ تعلق سطحی تھا اور میں ابھی پوری طرح اسے سمجھ بھی نہیں پایا تھا۔ (ص ۳۲)

(ج) "سنہ ۴۹ء کے اواخر میں میڈیکل کالج میں داخل ہوا اور اس وقت سے میں نے جماعت اور تحریک کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے مطالعہ شروع کیا تو اپنے تعلق کا

سطحی ہونا واضح ہوا۔ اور جماعت کی دعوت اپنی پوری گہرائی کے ساتھ دل و دماغ پر منکشف ہوئی (ص۳۳)

(د) "پھر میرا یہ دور چونکہ لاہور میں گذرا جہاں جماعت کا مرکز بھی ہے۔ لہٰذا مجھے جماعت کے اکابرین کے ساتھ ملاقاتوں، گفتگوؤں اور نشست و برخاست کا وافر موقع ملا اور اس پورے دور میں میں مولانا مودودی صاحب اور مولانا اصلاحی صاحب سے ذاتی ربط قائم کئے رہا اس سے قبل ان حضرات کی صرف تحریریں پڑھی تھیں۔ لیکن اس عرصہ میں ان کے ساتھ ذاتی ربط سے مجھے وہ کچھ حاصل ہوا جو محض تحریر پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ (ص۳۷)

(ھ) "۱۹۵۴ء کے اکتوبر میں میں ایم بی بی ایس کا آخری امتحان پاس کر کے تعلیم سے فارغ ہوا ——— اور زیادہ سے زیادہ ایک ماہ کے بعد یعنی ۵ ارنومبر ۱۹۵۴ء کو میں نے جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست دیدی" (ص۳۸) درخواست رکنیت پیش کر دینے کے بعد ہی میں نے فوراً جماعت کے ارکان کی طرح اپنے آپ کو نظم کا پابند بنا کر کام شروع کر دیا" (ص۳۹) "بہر حال فروری ۱۹۵۵ء میں میری درخواست رکنیت منظور ہو گئی ——— آج میری رکنیت کو ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو گیا ہے"۔ (ص۴۰)

اپنے بارے میں ان تصریحات سے مجھے دراصل دو باتوں کی وضاحت مطلوب ہے:۔

- ایک یہ کہ میں جماعت اسلامی میں نووارد سہی، لیکن تحریک اسلامی کے ساتھ میرا تعلق نیا نہیں ہے۔ بلکہ اسکے ساتھ میرے شعوری تعلق کا عرصہ بھی کم از کم چھ سال ہے ——— لہٰذا میری بات کو ایک نووارد کی بات سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیا جائے، بلکہ اس پر کم از کم اتنی توجہ ضرور صرف کی جائے، جتنی کسی پرانے خدمتگار کی بات پر کی جاتی ہے۔!
- دوسرے یہ کہ میں نے شہادت حق اور اقامت دین کو اپنے فرائض سمجھ کر ان کی ادائیگی

کے لئے جماعت کا دامن تھاما ہے۔ جماعت میں جو کام میں کرتا ہوں وہ جماعت کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے کرتا ہوں لہٰذا میری ان گذارشات کو lightly (سرسری) نہ لیا جائے بلکہ اگر یہ جماعت کے ذمہ دار حضرات کو لایعنی اور بے کار نظر آئیں تب بھی ان پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ میری بات نہ مانی جائے تو کم از کم مجھے تو سمجھا دیا جائے کہ میری غلطی کہاں ہے اور میرے طرز فکر میں ٹیڑھ کس جگہ واقع ہوا ہے۔ اس میں جماعت اور تحریک کا فائدہ نہ سہی لیکن یہ ذاتی طور پر مجھ پر ضرور احسان ہو گا"۔ (صنـ وصـ)

بنیادی غلطی کا سراغ

(اس سلسلے میں راقم السطور کو اپنا تحریری تسلسل قائم رکھنے کیلئے ڈاکٹر صاحب کے دیباچہ کی طرف ایک بار پھر لوٹنا پڑ رہا ہے۔ موصوف نے اپنے دیباچہ ہی میں ۱۸-۱۹ پر جماعت کی دعوت میں پیدا ہونے والی بنیادی غلطی کی نشاندہی فرماتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔)

"میں لکھ چکا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب، بیک وقت داعی دین بھی ہیں اور متکلم اسلام بھی اور ان کی دعوت کی رگ و پے میں فطری طور پر ان کے کلامی نظریات سرایت کئے ہوئے ہیں۔ اب ظاہر بات یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب اس دور کے متکلم ہیں جبکہ دنیا مختلف نظام ہائے حیات کے نظری و فکری ادوار سے گذر کر عملی زندگی کی نہج قرار پانے اور پھر ان کے باہمی تصادم کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں مولانا مودودی نے اسلام کا مطالعہ کیا تو وہ ان کو ایک بہترین نظام حیات اور انسانی زندگی کے تمام مسائل کا بہترین حل نظر آیا۔ چنانچہ یہی ان کی دینی فکر کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ جس کے یمین و یسار دو داعی بائیں) انھیں اسلام کے عقائد، اسکی عبادات اور اسکی شریعت کے تفصیلی احکام صف بستہ نظر آئے۔ اور اس طرح انھیں دین کا اصل مطالبہ یہ نظر آیا کہ اس نظام کلی کو نظام زندگی پر عملاً نافذ کر دیا جائے ——————— یہ تمام باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ لیکن مولانا مودودی صاحب کی تحریروں پر ان کا اس قدر غلبہ ہے کہ دین کے

دوسرے پہلو مثلاً بندے کا اپنے رب کے ساتھ تعلق اور اس میں عبدیت، انابت اخبات تضرع اور اخلاص فی الجملہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئے، اور جماعت اسلامی کی تحریک میں فرد پر اجتماعیت، باطن پر ظاہریت اور حیات اخروی پر حیات دنیوی اس طرح چھاگئے کہ اسکے کارکنوں کی زبان پر اگرچہ نجات اخروی بھی رہی۔ لیکن ان کی عملی سعی و جہد کا اصل مرکز و محور "دنیا میں اقامت دین" بن کر رہ گئی۔

اس موضوع پر مفصل لکھنے کی نوبت شاید پھر کبھی آئے اس وقت میں اس قدر کافی سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے ایک اہم سابق رکن اور وہاں کی مرکزی مجلس شوریٰ کے ممبر وحید الدین خانصاحب کی کتاب "تعبیر کی غلطی" کا تذکرہ کردوں اس کتاب کا اصل موضوع وہی ہے۔ جو اوپر بیان ہوا اور اس پر خانصاحب موصوف نے جس قدر محنت کی ہے۔ اور دین کے اس دوسرے پہلو کو جو جماعت اسلامی کی تحریک میں دب کر رہ گیا ہے۔ جس طرح اجاگر کیا ہے۔ اس کے لئے وہ شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔" (ص۱۸ و ص۱۹)

(کتاب ص۲۲ سے ص۱۰۵ تک "تحریک جماعت اسلامی کا دور اول" اور اسکے بنیادی افکار و نظریات کو بہت تفصیل سے پیش کرنے کے بعد جناب ڈاکٹر صاحب نے ص۱۰۹ سے ص۲۰۴ تک "دور ثانی" اور اس کی خصوصیات سے بحث فرمائی اور سرورق ہی پر یہ مصرعہ درج فرمایا ہے۔ ع "تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا" جس سے دور ثانی کا اجمالی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس مختصر سے کتابچہ میں ہر دو دور کی بحثوں کی تلخیص یقیناً موجب تطویل ہوگی اس لئے یہ صورت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب نے دور ثانی میں تحریک کے جس قسم کے زیغ و انحراف اور کج روی و گمراہی کی نشاندہی فرمائی ہے بالاختصار اسی کا تذکرہ کرکے موصوف کی جماعت سے علیحدگی کی وجہ متعین و مشخص کی جائے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب کے صـ۱۱۶ پر تحریر فرماتے ہیں :-

"اس دور (ثانی) کی "خشت اول" کی حیثیت رکھنے والی تقریر" مطالبہ نظام اسلامی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

حاضرین و حاضرات! یہ وقت جس سے ہم آج گذر رہے ہیں۔ ہماری قومی تاریخ کے نازک ترین اوقات میں سے ہے۔ اس وقت ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے سامنے جو دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کس کی طرف بڑھیں۔ اس موقع پر جو فیصلہ بہ حیثیت قوم ہم کریں گے۔ وہ نہ صرف ہمارے مستقبل پر بلکہ نہ معلوم کتنی مدت تک ہماری نسلوں پر آئندہ اثر انداز ہوتا رہے گا" (صـ۱۱۶)

. . . .

"اس موقع پر ذرا اوراق الٹ کر دور اول کی تحریروں کے وہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے جو صـ۵۵ سے صـ۵۹ تک درج ہیں (ان صفحات سے چند اقتباسات یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائے جائیں)

اقتباس صـ۵۶ "اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں۔ لیکن قریبی دور میں اس معجون کا اسلامی جزء اتنا کم اور قوم پرستانہ جزء اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے (دیباچہ حصہ سوم۔ سیاسی کشمکش)

صـ۵۷ قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کیلئے استعمال کیا ہے وہ "حزب" ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسل ونسب کی بنا پر اٹھتی ہیں۔ اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم

نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں ——— دوسرا لفظ جو پارٹی ہی کے معنوں میں قرآن نے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ وہ لفظ امت ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔" ——— تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے۔ وہ لفظ جماعت ہے۔ اور یہ لفظ بھی حزب کی طرح بالکل پارٹی کے ہم معنی ہے۔"

۵۸ "لیکن رفتہ رفتہ مسلمان اس حقیقت کو بھولتے چلے گئے۔ کہ وہ دراصل ایک
پارٹی ہیں اور پارٹی ہونے کی حیثیت ہی پر ان کی قومیت کی اساس رکھی گئی ہے۔ یہ بھلاوا بڑھتے بڑھتے اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پارٹی کا تصور قومیت کے تصور میں بالکل گم ہی ہو گیا۔ مسلمان اب صرف ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں۔" اور ——— "اسی جاہلیت کا ایک کرشمہ یہ ہے آپ کے اندر "قومی مفاد" کا ایک عجیب تصور پیدا ہو گیا ہے۔ اور آپ اس کو بے تکلف "اسلامی مفاد" بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد "اسلامی مفاد" یا "قومی مفاد" کیا چیز ہے۔؟ یہ کہ جو لوگ مسلمان کہلاتے ہیں ان کا بھلا ہو۔ ان کے پاس دولت آئے۔ ان کی عزت بڑھے۔ ان کو اقتدار نصیب ہو اور کسی نہ کسی طرح ان کی دنیا بن جائے۔ بلا اس لحاظ کے کہ یہ سب فائدے اسلامی نظریہ اور اسلامی اصول کی پیروی کرتے ہوئے حاصل ہوں یا خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ پیدائشی مسلمان یا خاندانی مسلمان کو آپ مسلمان کہتے ہیں۔ چاہے اس کے خیالات اور اس کے طرز عمل میں اسلام کی صفت کہیں ڈھونڈے نہ ملتی ہو گویا آپ کے نزدیک مسلمان روح کا نہیں بلکہ جسم کا نام ہے۔"

مسئلہ قومیت میں جماعت کے نظریات کی تبدیلی واضح کرنے کے بعد

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کے " اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" نامی مضمون کو موضوع بحث بنایا ہے۔ چنانچہ "نکتہ اول میں تضاد" کے زیر عنوان ص ۱۳۱ پر تحریر فرماتے ہیں:-

" دور اول میں پوری شدت کے ساتھ کہا گیا تھا کہ "اسلامی حکومت" کے قیام کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں اقتباسات مندرجہ ص ۶۳ تا ص ۶۸"

ص ۶۳ تا ص ۶۸ کے چند اقتباسات ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں

(الف) "نظام حکومت کا طبعی ارتقاء کے عنوان مولانا لکھتے ہیں:"

(ص ۶۳) "حکومت خواہ کسی نوعیت کی ہو مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہوا اور پھر ادھر سے لا کر اس کو کسی جگہ جما دیا جائے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اخلاقی نفسیاتی تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔" (ص ۶۳)

(ص ۶۴) ———— (ب) "درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لئے ناگزیر ہے کہ ابتداء میں ایک ایسی تحریک اٹھے جسکی بنیاد میں وہ نظریہ حیات وہ مقصد زندگی وہ معیار اخلاق وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہو۔ اسکے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کیلئے مستعد ہوں"۔ (ص ۶۴)

(ص ۶۵) ———— (ج) "بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اسکو "اسلامی اسٹیٹ" میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات، اور اجتماعیات کا

جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اسکی بنا پر میں اسکو ناممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہوجائے تو میں اسکو ایک معجزہ سمجھوں گا۔

جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو کسی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت میں کوئی مستقل تغیر نہیں کیا جا سکتا۔ (راقم السطور عرض کرتا ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات کو دیکھ کر یہ فیصلہ ذرا بھی مشکل نہیں کہ وہاں کی مصنوعی تدبیر سے نظام حکومت کی تبدیلی کوئی مستقل تغیر نہیں ہے۔) عمر بن عبدالعزیز جیسا زبردست فرمانروا جسکی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت تھی۔ اس معاملہ میں قطعی ناکام ہوچکا ہے کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کے لئے تیار نہ تھی۔ (یہ بات قابل غور ہے کہ تابعین و تبع تابعین کے دور میں تو سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کیلئے تیار نہ تھی مگر اب علامہ مودودی اور جنرل ضیاء الحق کے دور سعادت میں جو سوسائٹی ہے۔ وہ تبدیلی کیلئے تیار ہوگئی۔ ن۔ ز دمی) محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود نظام حکومت میں کوئی تغیر نہ کر سکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمراں حکومت میں نہیں صرف اسکے اوپری شکل میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر تعمیر ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار ان لوگوں کے ہاتھوں میں آتا ہے۔ جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے۔ اگر وہ صحیح اسلامی کیریکٹر کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اس بے لاگ عدل اور ان بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے تو ان

ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آسکتے
اس ذریعہ سے تو اقتدار ان ہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں تو چاہے
مسلمان ہوں مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جنکو اسلام کی ہوا بھی نہ
لگی ہو۔ ان لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسی مقام پر کھڑے ہیں
جس مقام پر غیر مسلم حکومت میں تھے بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر کیونکہ وہ "قومی حکومت"
جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہو گا۔ اسلامی انقلاب کا راستہ روکنے میں اس
سے بھی زیادہ جری و بے باک ہو گی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت
جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے۔ وہ مسلم قومی حکومت ان کی سزا پھانسی اور
جلاوطنی کی دے گی (مسٹر بھٹو کی پھانسی علامہ مودودی کے اس اندیشہ کی صحت
کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے یقیناً کافی ہو گی۔ خدا جانے علامہ کو مسٹر بھٹو کی پھانسی
کی تائید فرماتے وقت اپنی یہ پیشین گوئی یاد بھی تھی کہ نہیں۔ رومی)

"پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی قومی حکومت
کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔ اب سوال یہ ہے
کہ اگر ہم کو اس حکومت میں بھی اجتماعی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی
اور یہی کام حکومت کی مدد کے بغیر بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی
سے کرنا ہو گا۔ تو ہم آج ہی سے یہ راہ عمل اختیار کیوں نہ کریں۔ اس نام نہاد "قومی
حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اسکے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع
کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں۔ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہمارے مقصد
کے لئے نہ صرف مفید ہو گی بلکہ کچھ سد راہ ثابت ہو گی"۔ (صہ ۶۸ و صہ ۶۹)

(صہ ۶۹)۔(د) "اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت
کر کے ان کے نقطۂ نظر کو تبدیل کر کے اور ان کی نفسیات میں انقلاب برپا کر کے

ایک جمہوری نظام کو "ایسی نظام" میں تبدیل کیا جاسکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی ونفسیاتی انقلاب برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی۔؟ کیا وہ لوگ جو بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کرکے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ ان سے آپ یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ حکومت کاروپیہ اس کے وسائل اور اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کرینگے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومت الٰہی کے لئے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کی بجائے الٹی اس کی مزاحمت کریں گے۔ کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام کی نفسیات میں تغیر واقع ہوگیا تو اس بدلی ہوئی سوسائٹی میں ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کا مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی نسبت بہت زیادہ جسارت وبے باکی کے ساتھ ہر کوشش کو کچلیں گے۔ اور ان کے نام ان کے ظلم کی پردہ پوشی کے لئے کافی ہوں گے۔" (صٓ)

(تحریک جماعت اسلامی کے دور اول سے متعلق خود بانی تحریک کی یہ تحریرات ملاحظہ فرمانے کے بعد اب دور ثانی سے متعلق ڈاکٹر صاحب کے تاثرات اس دور کی تحریرات کے ساتھ ملاحظہ فرمایئے)

(صـ۱۱۹) پر فرماتے ہیں:— "نصب العین یعنی اقامت دین کے لئے طریق کار کے سلسلے میں جو وضاحتیں مثبت اور منفی طور پر دور اول میں کی گئی تھیں۔ ان کا خلاصہ گذشتہ صفحات میں دیا جاچکا ہے

———

—— اب دور ثانی کے طریق کار کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ع

"تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا"

جو باتیں وہاں بالکل غلط ٹھہرائی گئی تھیں، انہیں یہاں باقاعدہ اختیار کیا گیا جن ذرائع سے "اسلامی حکومت" کا قیام ناممکن العمل بتایا گیا تھا۔ انہی پر یہاں طبع آزمائی کی گئی تھی اور جس راستے کے اختیار کرنے پر مسلم لیگ کی تنقیص کی گئی تھی ٹھیک اسی راستے پر جماعت اسلامی نے پیش قدمی شروع کر دی۔ دور اول اور دور ثانی کے مابین طریق کار کا یہ اختلاف بلکہ تضاد اتنا واضح ہے کہ درحقیقت اسکے بیان کرنے کی ضرورت بھی موجود نہیں ہے۔" (صفحہ ۱۲۰) ــــــــــــ

دو نکاتی پروگرام

پاکستان میں جماعت اسلامی نے جو طریق کار اختیار کیا وہ اول روز ہی سے دو نکات پر مشتمل تھا۔ ــــــــــ ایک یہ کہ اس ملک کے دستور کو اسلام کے اصولوں کے مطابق بنوانے کی سعی کی جائے اور اسکے لئے رائے عامہ کو منظم کر کے جدوجہد شروع کی جائے اور ــــــ ــــــ دوسرے یہ کہ یہاں کی قیادت میں انقلاب برپا کیا جائے۔" (صفحہ ۱۲۰)

[ملک پاکستان کے دستور کو اسلام کے اصولوں کے مطابق بنوانے کیلئے جماعت نے جو مطالبہ کیا اس کی تفصیل ڈاکٹر صاحب نے صفحہ ۱۲۲ پر یوں نقل فرمائی ہے]

" دستور ساز اسمبلی سے مسلمانان پاکستان کا مطالبہ"۔ (صفحہ ۱۲۱)

چونکہ ــــ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت (جن میں سے زیادہ تر صرف نسلی مسلمان ہوں گے) اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے ــ اور ــــ چونکہ پاکستان کی آزادی کے لئے مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیاں صرف اس خاطر تھیں کہ وہ ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ لہٰذا ــــــ اب قیام پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کا اعلان کرے کہ

(۱) پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور حکومت پاکستان کی اسکے سوا اور کوئی حیثیت نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اسکے ملک میں پوری کرے۔

(۲) پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے

(۳) تمام وہ قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں۔ منسوخ کئے جائیں گے۔ اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف پڑتا ہو۔

(۴) حکومت پاکستان اپنے اختیارات ان حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کردیئے ہیں۔

اس کے فوراً بعد اپریل اور مئی ۱۹۴۸ء میں مغربی پاکستان کا ایک مفصل دورہ کرکے مولانا مودودی صاحب نے ——— جماعت اسلامی کے زیر اہتمام جلسہ ہائے عام منعقد کراکے اس مضمون پر مشتمل تقاریر فرمائیں۔ (ص ۱۲۴) ———

ان تقاریر میں مولانا نے مطالبہ نظام اسلامی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور اس کو ان دو امور پر مبنی قرار دیا کہ :-

"اولاً جب ہم مسلمان ہیں تو ہماری حکومت کو بھی مسلمان ہی ہونا چاہیئے۔ اور ثانیاً یہ کہ ہمارے مطالبہ پاکستان کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہم یہاں کا نظام اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔ پچھلے دس سال میں بہ حیثیت قوم ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک خطۂ زمین ایسا ملنا چاہیئے"۔ (کیسا کھلا ہوا مغالطہ ہے کہ مسلم لیگ کے جس مطالبہ پاکستان کی پہلے تردید و تنقید کرتے رہے تھے موقع آنے پر کس طرح اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ کہہ دیا۔ رومی)

پھر اسکے لئے ایک اور جذباتی اپیل یہ کی، کہ "تقسیم ہند نے قدیم ہندوستان کے اکثر حصے میں تو اس کی مستقبل تاریک کرہی دیا ہے (ہندوستان میں اسلام کا

مستقبل پہلے کیوں روشن تھا۔ جب پٹھان کوٹ میں دارالاسلام قائم فرمالیا گیا تھا۔ (دمی) اب رہ گیا وہ قلیل علاقہ جس پر پاکستان مشتمل ہے تو یہاں بھی اگر اسلامی نظام قائم نہ ہوا تو گویا یہ پورے برصغیر سے اسلام کا خاتمہ ہوگا" اور اسے مطالبہ کی صورت میں پیش کرنے کی وجوہات یہ بیان کیں کہ ——— "اولاً یہاں ایک مصنوعی انقلاب" برپا ہوا ہے۔ اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر رونما ہوتا تو اس مطالبے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ بلکہ انقلاب کے فوراً بعد آپ سے آپ اس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ———

——— دوسرے اسلئے بھی کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اپنی باگیں دیدی ہیں (یہ خط کشیدہ فقرہ لائق توجہ ہے صرف خدا تعالیٰ کی حاکمیت وسلطانی کے قائل نے کس طرح اپنی باگیں ایسے لوگوں کو دیدی ہیں جو) متضاد باتیں کہہ رہے ہیں۔ یہ حضرات کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاکستان حاصل کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اگر یہاں اسلامی نظام حکومت قائم نہ کیا جائے، کبھی کہتے ہیں کہ یہاں ایک لادینی جمہوری اسٹیٹ قائم کیا جائے گا۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں قرآن کی حکومت ہوگی اور کبھی یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہاں سیاسی حیثیت سے نہ ہندو ہندو ہوگا۔ نہ مسلمان مسلمان ہوگا۔ بلکہ سب محض پاکستانی ہو کے رہینگے"۔ (ص ۱۲۵) ———

نکتۂ اول میں تضاد

اس عنوان کے تحت ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب کے ص ۱۳۱ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"دور اول میں پوری شدت کے ساتھ کہا گیا تھا کہ" اسلامی حکومت کے قیام کا بس ایک ہی راستہ ہے" ——— لیکن اب پورے اطمینان سے کہہ دیا گیا کہ" واضح طور پر جان لیجئے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام صرف دو طریقوں سے ممکن ہے۔ (یعنی پاکستان بننے کے بعد اسلامی حکو قائم کرنے کے لئے ایک اور طریقہ

کا اضافہ ہو گیا) ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

(پہلے طریقہ کو) "ایک طریقہ کی حیثیت سے تسلیم کر کے ترک کر دیا گیا اور اس طریقے کو اپنا لیا گیا۔ جس کے بارے میں باوضاحت کہا گیا تھا کہ اس سے اسلامی حکومت کا قیام ممکن ہی نہیں ہے۔" (صـ ۱۳۲)

دور اول میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تحریک مسلم لیگ اپنی نوعیت اور طریق کار سے صرف ایک قومی اسٹیٹ وجود میں لا سکتی ہے۔ اسلامی ریاست کا اس کے ذریعہ قائم ہو جانا بالکل ایسے ہے جیسے نیم کے بیج سے آم کا درخت اگ آنا ــــــــ لیکن اب زوردار دلائل کے ساتھ ثابت کیا جانے لگا کہ تحریک پاکستان کا عین تقاضا یہ ہے کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہو۔ اور اس میں ایک ٹھیٹھ اسلامی ریاست قائم ہو۔" (صـ ۱۳۲)

"اس عنوان کے تحت صـ ۱۳۵ پر فرماتے ہیں:-

نکتۂ ثانی میں تضاد "انقلاب قیادت کے بارے میں پہلا نقطۂ نظر یہ تھا کہ "قومی ریاست میں جب تک ووٹروں ہی کے افکار و نظریات و ذہنیت وعقاید بدل نہ دیئے جائیں اس وقت تک کسی اصول پسند اور اسلام پسند قیادت کا ان میں سے ابھرنا بالکل ناممکن ہے" (جیسا کہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے) ــــــــ لیکن اب عوام کی ذہنیت ان کی پسند اور ان کی ناپسند ان کے خیالات و افکار اور انکی سیرت و اخلاق میں انقلاب پیدا کئے بغیر محض اس بات سے کہ انھیں اس وقت "قومی قیادت" سے بدظن اور مایوس کر دیا جائے۔ اس بات کی توقعات کی جا رہی تھیں۔ کہ ایک صالح قیادت برپا ہو جائے گی"۔

ــــــــ (چند سطروں کے بعد صـ ۱۳۶ پر) آخر اس وقت

انفرادی اور اجتماعی زندگی جس نہج پر گذاری جارہی تھی اس میں کونسا اصولی اور بنیادی تبدیلی واقع ہوا تھا۔؟ کیا لوگوں کے نظریات بدل گئے تھے۔ ان کے افکار میں انقلاب آچکا تھا۔ کیا ان کی پسند اور ناپسند کا معیار اسلام اور صرف اسلام بن چکا تھا۔؟ کیا انہوں نے اسلام کے مطابق اپنے اخلاق و معاملات کو تبدیل کر لیا تھا ــــ؟ کہ اب اس بات کی توقع کی جاتی کہ ان کی قیادت میں اس طرح کی تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔ کہ ایک صالح قیادت برسر کار آجائے ــــ

ــــ اور اگر ایسی کوئی تبدیلی پورے نظام زندگی میں واقع نہیں ہوئی تھی اور یقیناً بالکل نہیں ہوئی۔ تو پھر انقلاب قیادت کی توقع بچوں کی سی خام خیالی سے زیادہ اور کیا قرار دی جا سکتی ہے۔" (ص ۱۳۶)

یہ صحیح ہے کہ آپ اس وقت کی قیادت کرنے والی ٹیم پر تنقید کر کے اسے کمزور کر سکتے تھے ــــ لیکن یہ بات آپ نے کس طرح سمجھ لی تھی کہ اس طرح قیادت میں صالح انقلاب بھی برپا کیا جا سکتا ہے اس تخریب کے بعد کسی تعمیر کی توقع بالکل غلط تھی۔ تخریب آپ کر سکتے تھے اور آپ نے کی۔ لیکن تعمیر کے سلسلے میں آپ کی توقعات "سہانے خواب" سے زیادہ حقیقت نہ رکھتی تھیں۔ اور اس کا تجربہ آپ کو بعد کے حالات سے ہو گیا۔" (پاکستان کے حالیہ انقلاب کی صورت میں، یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اگر یہاں نظام مصطفٰے کے قیام کا اعلان اور نفاذ ہو جانے کے بعد توقاعدہ سے جنرل صاحب موصوف ہی وہاں کے امیر المومنین قرار پا جائیں۔ اور دوبارہ الیکشن وغیرہ کا کوئی کھڑاگ نہ کیا جائے۔ روحی)

"قرار دادِ مقاصد" (کے زیر عنوان) موصوف ص ۲۹ پر فرماتے ہیں:۔

"مولانا مودودی صاحب نے ۱۹۴۸ء کے اوائل میں کام

کی ابتدا ایک وقت دو نعروں یعنی "دستور اسلامی" اور "انقلاب قیادت" سے
کی تھی۔ اور دونوں کیلئے ابتدائی کام بھی خود ہی مکمل کر دیا تھا۔ ۱۹۴۸ء کے اواخر میں
مولانا تو گرفتار کر لئے گئے لیکن "دستور اسلامی" کی یہ مہم زور پکڑتی چلی گئی۔
بالآخر ۱۲ مارچ کو قرارداد مقاصد پاس ہوگئی۔" (آگے چل کر ص ۱۱۱ پر
فرماتے ہیں) اس قرارداد کے پاس کرنے والوں کے بارے میں مولانا مودودی کے
ریمارکس ملاحظہ ہوں :-

ان حضرات کے قرارداد مقاصد پاس کرنے کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے
کوئی میم صاحبہ کسی مسلم نواب یا رئیس زادے سے نکاح کرانا چاہے۔ اور وہ اپنے
اور اپنی اولاد کے لئے وراثت کے حقوق اور مسلمان سوسائٹی میں برابری کے حقوق
حاصل کرنے کے لئے کلمہ اسلام پڑھ لے لیکن نہ اس کلمے سے پہلے اسکی زندگی میں
کوئی تغیر آئے اور نہ اسکے بعد کوئی تبدیلی رونما ہو۔ جیسی میم صاحبہ وہ پہلے تھیں ویسی
میم صاحبہ وہ بعد میں رہیں۔ (علامہ مودودی کے یہ ریمارک صاف بتا رہے ہیں کہ
علامہ نے موجودہ سیاسی پارٹیوں سے جو عقد اتحاد فرمایا ہے وہ کچھ اسی قسم کا عقد ہے۔ رضی)

(اور آگے چل کر ص ۱۴۳ پر فرماتے ہیں) "ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا جماعت
اسلامی منتظر بیٹھی تھی کہ دستور ساز اسمبلی ذرا ایک بات کہہ دے خواہ وہ کتنی ہی ناقص
اور نامکمل ہو تو فوراً اسلامی ریاست کا لیبل پاکستان پر چسپاں کر دیا جائے۔

بہرحال، ریاست پاکستان کی نئی نظری حیثیت نے جماعت اسلامی کے
طرز عمل کو ایک سیاسی جماعت کے نقشے پر ڈھال دیا۔" (ص ۱۴۴)

(ص ۱۴۵ پر) "اور یہ بھی اسی کا شاخسانہ تھا کہ چند سال بعد ہی جماعت کی
رکنیت سے ملازمین سرکار کو مستثنیٰ کر دیا گیا۔" (اگلے صفحہ پر) "دین اور سیاست
کی وحدت کا سب سے بڑا علمبردار بالآخر یہ کہنے لگا کہ :-

"سرکاری ملازمین سیاست میں حصہ نہ لیں۔ (تقریر حیدرآباد اور رسائل و مسائل)۔

(۱۹۵۸ء) "جوں جوں وقت گذرا اور دور ثانی کے طریق کار کے نتائج رونما ہونے شروع ہوئے۔ رنگ قدیم پھیکا پڑتا چلا گیا۔ اور وہ رنگ نمایاں ہوتا گیا جو اس دور جدید کے طریق کار کا فطری اور منطقی نتیجہ تھا۔ اور آج ـــــــــــ اس وقت کی اصول پرستی کو ایک حماقت قرار دینے والے بھی جماعت میں پائے جاتے ہیں بلکہ اس کے اہم مناصب پر فائز ہیں۔ (صفحہ ۱۵۸ کے حاشیہ پر فرماتے ہیں):۔

بعد کے حالات میں جماعت اسلامی نے اپنے مخصوص طریق انتخاب کی تمام شقوں کو ایک ایک کر کے جس طرح ترک کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ پہلے "پارٹی سسٹم" اور پارٹی ٹکٹ کو "حلال" کیا گیا۔ ـــــــــــ پھر "امیدواری" کو مسلمان کیا گیا ـــــــــــ غرض ـــــــــــ

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں ✻ ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

سیرت و کردار کا انحطاط

اس عنوان کے تحت کتاب کے صفحہ ۱۷۶ پر ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

"سیرت و اخلاق و کردار کا سرمایہ جو کسی انقلابی جماعت اور خصوصاً اسلامی جماعت کی اصل قوت تسخیر ہوتا ہے۔ اب رفتہ رفتہ کم ہو کر ختم ہونے پر آرہا ہے۔ ـــــــــــ جماعت کے عام ارکان ہی نہیں اسکے بڑے بڑے لوگوں کے "معاملات" بھی عوام میں زیر بحث آ کر پوری جماعت کو بدنام کرنے کا موجب بنتے ہیں۔" (صفحہ ۱۸۰ سے صفحہ ۱۸۲ تک جوش کار اور جذبہ ایثار میں کمی کے عنوان پر کچھ بحث فرمائی ہے۔ پھر صفحہ ۱۸۲ کے آخر میں فرماتے ہیں۔)

"نئی بھرتی کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے صرف وہی لوگ کام کرنے پر آمادہ

ہوتے ہیں کہ جنہیں کام کوئی معاوضہ بھی دیا جاتا ہو۔ ان "تنخواہ یافتہ" لوگوں کے علاوہ کوئی کام کرنے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوتا ہے۔ اور یہ بامعاوضہ کام کی لے اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی سے معمولی کاموں کے لئے بھی بلا معاوضہ خدمات دستیاب نہیں ہوتیں۔ بامعاوضہ ہی کام کرانا پڑتا ہے۔

(ص ۱۸۳ پر فرماتے ہیں) "من حیث المجموع اس وقت جماعت اپنے تنخواہ یافتہ کارکنوں کے سر پر کھڑی ہے۔ ذرا انہیں ایک مرتبہ ہٹا دیجئے۔ آپ کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ جماعت کا پورا ڈھانچہ کس طرح زمین پر آ رہتا ہے۔"

(ص ۱۸۳ پر ہی فرماتے ہیں) "مجھے اس پر حیرت نہیں ہے کہ یہ کیفیات کیوں پیدا ہو گئیں۔ ان کا پیدا ہونا فطری اور لازمی تھا، جو طریق کار ۱۹۴۷ء میں اختیار کیا گیا تھا۔ اس نے جماعت کو پہلے تو ایک "انقلابی جماعت" کے مقام سے گرا کر ایک "قومی جماعت" بنایا اور پھر قومی سے بھی گرا کر ایک "سیاسی جماعت" بنا کر رکھ دیا۔ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کے کارکنوں کے نقطہ ہائے نظر اور ان کی کیفیات کا بدلنا لازمی تھا۔ یہ کیفیت رونما ہوئی تو اس میں حیرت واستعجاب اور چیخ و پکار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ حیرت ہوتی ہے اس پر کہ جماعت کی قیادت کے سامنے جب یہ اثرات اور نتائج پیش کئے جاتے ہیں تو بڑے ہی تعجب اور حیرت کے ساتھ فرمایا جاتا ہے: "اچھا اب جماعت میں یہ بھی ہونے لگا ہے" یا گویا کہ اس کا ہونا غیر متوقع اور ناگہانی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا یہ صرف ایک "اسلوب بیان" ہے یا واقعتہً جماعت اسلامی کے قائد اس موٹی سی بات سے بے خبر ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ ہمارے موجودہ طریق کار کے فطری اور لازمی نتائج ہیں۔" (ص ۱۸۴)

محبت اور اخوت کا فقدان کے زیر عنوان فرماتے ہیں:-

"جماعت کے متعلقین کے آپس کے تعلقات بھی اب مایوس کن حد تک کمزوری نہیں بلکہ بعض جگہ تو افسوسناک حد تک خراب ہیں"۔ —— (صہ ۱۸۴)

"اب جماعت کے اراکین کی آپس کی مقدمہ بازیاں ہی جماعت کے لئے ایک دردِ سر بن گئی ہیں۔ ارکان جماعت کے جھگڑوں اور قضیوں کا نمٹانا ہی (بقول مولانا امین احسن اصلاحی) امراء جماعت کی سب سے بڑی مصروفیت ہے —— باقاعدہ دھڑے بندیوں کا سراغ ملتا ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوششیں نظر آتی ہیں"۔ (صہ ۱۸۵)

نقوش تازہ کے جلی عنوان کے تحت "عوام پرستی" کی ایک ذیلی سرخی قائم فرما کر صہ ۱۸۱ پر تحریر فرماتے ہیں:-

"اس دور میں حق پرستی کی بجائے "مصلحت پرستی" اور "عوام پرستی" جماعت اسلامی کے طرز عمل کی نمایاں خصوصیت ہے" —— (صہ ۱۸۱ پر) "جب تک یہ ایک اصولی جماعت کی حیثیت سے کام کرتی رہی اس میں حق پرستی اور حق گوئی کی شان بالکل نمایاں رہی —— لیکن جب اس نے ایک قومی جماعت کا روپ دھار لیا تو وہ اصول پرستی اپنی موت آپ مر گئی" ——

—— ظاہر ہے کہ ایک قومی جماعت کے لئے ملکی اور قومی مسائل میں قومی میلانات و رجحانات اور قوم کے احساسات و جذبات کو لازماً ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ یہی جماعت اسلامی کو بھی کرنا پڑا"۔ ——

اس داستان کا المناک ترین بات مسئلہ قادیانیت میں جماعت اسلامی کا طرز عمل ہے۔ اسکے دوران جماعت اور اسکے قائدین نے جس طرح اپنے اصولوں کی بجائے

عوام کے چشم ابرو کے اشاروں پر حرکت کی ہے۔ اسے دیکھ کر انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ ——————————————

———— اتنی قلیل مدت میں ایک جماعت کا مزاج اس درجہ بھی بدل سکتا ہے۔؟" (صہ ۱۸۸)

———— (چند صفحات تک مسئلہ قادیانیت کے سلسلہ میں جماعت کی مصلحت پرستی و عوام پرستی کی تفصیلات ذکر کی گئی ہیں۔ آگے صہ ۱۹۵ پر فرماتے ہیں:۔

• دعوت، تنظیم اور اصلاح و تربیت کا کام بھی نہ صرف یہ کہ سیاسی مصروفیتوں کے باعث بالکل نہ ہو سکا۔ بلکہ اس سلسلے میں جماعت کا سارا زور "خود کو" بدلو" کی بجائے "حکومت سے مطالبہ کرو" پر رہا ———— اس پورے عرصہ میں جبکہ جماعت دستور اسلامی کی مہم چلاتی رہی ایک طرف جدید تعلیم یافتہ طبقے میں تجدد پسندوں کے افکار و خیالات تیزی سے پھیلے اور دوسری طرف پرانے دینی طبقوں کو جن سے ٹوٹ کر لوگ جماعت میں شامل ہو رہے تھے۔ اپنے تحفظ کا موقع مل گیا۔ اور انہوں نے اپنے حلقوں کے گرد ایسا حصار کھینچ لیا کہ اب اگر جماعت کوشش کرے تب بھی اپنے افکار و خیالات کو آسانی کے ساتھ اس حلقے میں نہیں پھیلا سکتی چنانچہ آج جماعت دونوں اطراف سے "اچھوت بنا کر رکھ دی گئی ہے۔ قدامت پسند گروہ میں وہ تجدد پسند مشہور ہے۔ اور تجدد پسند گروہ اسے قدامت پسندی کے طعنوں سے نوازتا ہے ———— اسکی بات وہ نہ سنتے ہیں کہ جن پر جدید رنگ غالب ہے اور نہ وہ سنتے ہیں کہ جن پر قدیم رنگ پختہ ہے۔ ایک بہت ہی پتلی سی تنگ نائے ہے۔ جو "کچھ ادھر کے اور کچھ ادھر کے" اور زیادہ صحیح الفاظ میں "نہ ادھر کے اور نہ ادھر کے" لوگوں پر مشتمل ہے۔" (صہ ۱۹۵ و صہ ۱۹۶)

(صہ ۱۹۶ پر فرماتے ہیں) ———— "اس دور ثانی میں سیاسی

مصروفیات کے علاوہ اگر کسی کام پر فی الواقع توجہات اور سعی وجدوجہد مرکوز ہوئی ہیں تو وہ خدمت خلق کا کام ہے۔ اس کام کیلئے وقت اور ذرائع اس لئے نکل آئے کہ وہ دراصل سیاسی کام ہی کا ایک ضمیمہ تھا۔ اور اس سے اصل مقصود سیاسی اغراض تھیں اور یہ بات کہ دستوری جدوجہد کے زمانہ میں جبکہ علمی اور تعلیمی کام بیک قلم موقوف ہو گئے۔ اور دعوت وتربیت کیلئے وقت قطعاً نہ مل سکا۔ اس کام کیلئے وافر وقت اور وافر قوت لگائی گئی اس بات کا بین اور ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اس سے اصل مقصود رضائے الٰہی کا حصول اور اس کا اصل محرک خدمت خلق کا جذبہ نہیں بلکہ مقصود اصلی ارزاں شہرت اور محرک اصلی اس کی طلب تھی۔

(اسی صفحہ ۱۹۶ کے آخری پیرے میں) " اس شعبہ خدمت خلق نے جہاں اور بہت سے نقصانات جماعت اور اس کے کام کو پہنچائے ہیں وہاں اسی کی وجہ سے ایک بہت بڑی پیچیدگی علماء کے اس طبقہ کا جماعت سے خبردار اور ہوشیار ہو جانا تھا جن سے زکوٰت وصدقات اور چرم ہائے قربانی و عقیقہ چھین کر ان کے معاشی وسائل میں دست اندازی کی تھی۔ (اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کی تعبیر کچھ اس قسم کا تاثر دیتی ہے کہ علماء جنہوں نے مسئلہ زکوٰۃ اور بحث تملیک میں صرف اس وجہ سے دلچسپی لی تھی کہ جماعت نے ان کے معاشی وسائل پر ہاتھ مار دیا تھا۔ تو یہ تاثر یقیناً لائق تردید ہے۔ اور خیال ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلہ کو خالص معاشی ہی بنیاد پر موضوع بحث بنایا ہے۔ جو موصوف کی زبردست بے خبری کا ثبوت ہے۔)

(صفحہ ۱۹۶ پر) یہاں سوال صرف علماء کے ایک طبقے کی معاش ہی کا نہیں اس پورے قدیم نظام تعلیم کا بھی تھا۔ جس کے فائینانس (اقتصادیات) بالیات،

کا سب سے بڑا ذریعہ زکات وصدقات ہی کی رقوم تھیں۔

چنانچہ تملیک زکات کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے سلسلے میں جماعت اسلامی کی سب سے بڑی اہل علم اور اہل قلم ہستی نے "علمی بزدلی" کا بین ثبوت فراہم کیا۔ اول اول جب یہ مسئلہ چھڑا تو جواب دینے کے لئے میدان میں مولانا مودودی صاحب تشریف لائے اور اینچ پیچ کے ذریعے جواب دینے کی کوشش کی۔ آپ نے ایک طرف "لام تملیک" کو اصولاً تسلیم کر لیا۔ (اسلئے کہ یہ اس ملک کی واضح اکثریت کی فقہ کا متفقہ اصول تھا) لیکن ایک لمبے اور پیچیدہ استدلال سے اس کی ایسی توجیہ کی کہ جس سے اسکی عملی قید و پابندی ختم ہو جائے۔ علماء کرام میں سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے ایک مدلل جواب دیا اور مولانا کے استدلال کی کمزوری کو واضح کر دیا۔ اب صحیح طریقہ یہ تھا کہ مولانا خود ہی سامنے آتے اور یا تو اپنی غلطی تسلیم کر لیتے (ڈاکٹر صاحب کی اس خوش فہمی پر تعجب ہے علامہ مودودی نے غلطی تسلیم کر لینے کا سبق اپنے استاد حقیقی سے سیکھا ہی کب ہے۔ کہ وہ غلطی تسلیم کر لیں۔ ردی) یا پھر لام تملیک کا انکار کر کے نیا استدلال قائم کرتے لیکن انھوں نے اس موقع پر مولانا اصلاحی صاحب کو جواب کیلئے آگے لا کھڑا کیا۔ اور انہوں نے لام تملیک ہی سے انکار کر کے اس مخمصے کو ختم کیا۔ جس میں مولانا مودودی صاحب پھنس گئے تھے"۔ (صد ۱۹۸)

(صد ۱۹۹ پر "حلقۂ متفقین" کی ذیلی سرخی کے تحت فرماتے ہیں:۔)

حلقۂ متفقین

اس دور ثانی میں ایک اور نمایاں بات جو کہ دور اول سے بالکل متضاد نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اب جماعت کا سارا زور "رکنیت سازی" سے ہٹ کر "متفقین سازی" پر ہو گیا ہے۔ یہ بھی دوسری تمام چیزوں کی طرح اس طریق کار کا ایک فطری تقاضا تھا کہ جو ۱۹۴۷ء

میں اختیار کیا گیا ـــــــــ وہی مولانا امین احسن اصلاحی ـــــــــ
سنہ ۵۵ء کی ابتداء میں منٹگمری کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"جماعت اسلامی کی رکنیت کا معاملہ بڑے کھکھیڑ کا معاملہ ہے۔ اگر آپ اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکیں تو حلقۂ متفقین میں شامل ہو جایئے"۔ (روایت بالمعنی)

ـــــــــ جماعت کی شوریٰ نے جو فیصلہ ملازمین سرکار کے بارے میں کیا اس میں بھی دانستہ یا نادانستہ اس قسم کے الفاظ آ گئے تھے ـــــــــ "جماعت ان لوگوں کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی"۔

ـــــــــ لوگوں کو مشورے دیئے جاتے ہیں۔ کہ رکنیت مت اختیار کرو۔ بلکہ فلاں جگہ جا کر "ایسے ہی" کام کرو۔ اگر رکن بن جاؤ گے تو "وہاں" کام کیسے ہو گا۔"؟ (ص ۲۰ پر) "مجھے انہیں سے کوئی بات (کوئی تبدیلی) بھی خلاف توقع نظر نہیں آتی سنہ ۴۱ء میں جو بیج بوئے گئے تھے یہ انہی کی نسل ہے"۔ (اسی صفحہ ۲ پر نظام بیت المال کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں):۔

"نظام مالیات بھی از سر تا پا تبدیل ہو چکا ہے۔ دور ثانی کی ابتداء ہی جب اخراجات تیزی کے ساتھ بڑھنے شروع ہوئے ـــــــــ اس لئے روپے کی فراہمی کیلئے متفقین اور متاثرین کی طرف باقاعدہ رجوع کیا گیا اور جوں جوں "بھاتی کام" بڑھتا گیا اور اخراجات زیادہ ہوتے چلے گئے "فراہمی زر" بھی باقاعدہ مہم کی شکل اختیار کرتی چلی گئی (راقم السطور عرض کرتا ہے گویا "بھاتی کاموں" ہی کیلئے رقوم زکات و چرم قربانی وغیرہ پر ہاتھ مارا گیا تھا۔ علماء کو اسی پر اعتراض تھا مگر ڈاکٹر صاحب یہ سمجھ بیٹھے کہ ان کی معاش پر دست اندازی موجب اعتراض ہوئی)

ـــــــــ رفتہ رفتہ طریق بھی بدل دیا گیا۔ باقاعدہ اپیلیں کر کے چندے جمع کئے گئے۔ مہموں کی شکل میں پیسے فراہم کئے گئے۔ لوگوں کے مکانوں اور دوکانوں

پر حاضر ہو کر "اعانت" طلب کی گئی۔ اور رفتہ رفتہ وہ سارا وقار خاک میں ملا دیا گیا۔ کہ جو دور اول میں مخصوص انداز جماعت کے طریق کار سے پیدا ہوا تھا۔ اور اب تو نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ ایک باقاعدہ طبقہ ایسے "ہمدردوں" کا بن چکا ہے کہ جن سے جماعت کی اپیل ہے ہی صرف یہ کہ "پیسے دو" نہ یہ دعوت ہے کہ "خود کو بدلو"۔ نہ یہ ترغیب ہے کہ جماعت کے رکن بنو۔ دعوت ہے تو ایک اور ترغیب ہے تو بس یہ کہ پیسے دیئے جاؤ ——— (ڈاکٹر صاحب نے تحصیل چندہ اور فراہمی زر پر روشنی ڈالی ہے اور علامہ کوثر نیازی نے اخراجات کی بے احتیاطیوں کا پردہ چاک فرمایا ہے۔ جسکے اقتباسات احقر کے کتابچہ "تحریک مودودیت کے ایکسرے رپورٹ" میں پیش کئے جا چکے ہیں)۔

صد ۲۰۲ پر اس عنوان کے تحت ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

نتیجۂ کلام "اس جائزے کے دوران جن آرا کا میں نے اظہار کیا ہے اور جس نقطۂ نظر کو میں نے بیان کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ کہیں کہیں تو اس سے اختلاف ممکن ہے لیکن مجموعی طور پر اس سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔ جماعت کی قبل از تقسیم اور بعد از تقسیم کی پوری داستان اس طرح سامنے رکھدی گئی ہے۔ کہ اس کے ان دو ادوار کے نقوش بالکل واضح ہو کر سامنے آگئے ہیں۔

——— دور ثانی کے نقوش کا سرسری مطالعہ بھی یہ واضح کر دینے کے لئے کافی ہے کہ اس میں ایک اصولی اسلامی جماعت کی خصوصیات کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔ یہ ایک خالص بے اصولی قومی جماعت کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ جو یا تو واقعی اسلام پسند ہے یا اپنی قوم میں برسر اقتدار آنے کیلئے اسلام کو بطور نعرہ (SLOGAN) استعمال کر رہی ہے۔ (علمائے حق نے بجا طور پر بہت پہلے ہی یہ حقیقت سمجھ لی تھی کہ جماعت کا صرف نعرہ ہی نعرہ ہے۔ اسلام حقیقی اسکی منزل

مقصود ہرگز نہیں ہے۔ (ص۲۰۱)

(آگے ص۲۰۲ پر فرماتے ہیں) "طریق کار کی اس تبدیلی نے جماعت کو سطحی طور پر متاثر نہیں کیا بلکہ اس کو جڑوں سے لے کر شاخوں تک اور سر سے لے کر پیر تک بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اب اس جماعت کی بنیادی نوعیت تک میں فرق ہو چکا ہے یہاں تک کہ جماعت کی پندرہ سالہ (یہ بات ۱۹۵۶ء میں کہی گئی ہے اب مدت اور زیادہ ہو چکی ہے۔) زندگی کے یہ ادوار کسی ایک ہی تحریک کے دو مراحل قرار نہیں دیئے جا سکتے بلکہ ان میں ہر مرحلہ بجائے خود ایک مستقل تحریک ہے اور یہ دونوں تحریکیں آپس میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ اور ان میں سوائے ایک نام کے اشتراک کے اور کوئی قدر مشترک باقی نہیں ہے۔ ـــ

میری رائے میں جماعت اسلامی کی اصل تحریک ۱۹۴۷ء میں حقیقتاً اور اصولاً ختم ہو گئی تھی ـــ

ــــــــ اب اس تحریک میں سے اگر کچھ باقی ہے وہ ان چند نیک دل اور مخلص لوگوں کے ارادہ اور کچھ نہیں۔ جنہیں اس اصلی تحریک کی دعوت نے کھینچا تھا۔ اور جو ابھی تک جماعت اسلامی کی قومی تحریک کا دامن اسی اصل تحریک اسلامی کے مغالطے میں تھامے چلے آ رہے تھے ــــــــــ لیکن سوائے چند کے کوئی نہیں جانتا کہ جسے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں وہ ایک ایسی بے جان نعش ہے جس کی روح کبھی کی پرواز کر چکی ہے۔" (ص۲۰۳)

ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے مندرجہ بالا اقتباسات اوپر پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہ اقتباسات ان حضرات کو دعوت فکر دینے کیلئے بہت اہم ہیں۔ جو اب بھی اس مغالطہ کا شکار ہیں کہ علامہ مودودی اور ان کی جماعت اسلام حقیقی کی طرف ایسی ہی دعوت دے رہے ہیں جیسے علماء حق دیتے چلے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی

رحمتیں نازل فرمائے ۔۔۔ ان علماء حق پر جنہوں نے اپنے نورِ باطن اور فراستِ ایمانی سے مودودیت کی کجروی اور گمراہی کو روزِ اول ہی سے محسوس فرما کر امت کی رہنمائی کا حق ادا فرما دیا تھا ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے"۔ (دمی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آپ بیتی ہے؟

جماعت سے علیحدگی کا سبب

تاثرات و اعتراضات

(از: جناب حکیم عبید اللہ خاں صاحب)

"اسلامی سیاست یا سیاسی اسلام"

مندرجہ ذیل سطور جناب مولانا حکیم عبید اللہ خاں صاحب رکن جماعت اسلامی سرینگر کے ذاتی تاثرات ہیں۔ جو موصوف نے اپنی تصنیف "اسلامی سیاست یا سیاسی اسلام" میں سپرد قلم فرمائی ہیں۔ (ازراہ اختصار ہم موصوف کی کتاب کے حوالہ سے صرف وہ حصہ نقل کرینگے جس سے ان کی وجہ علیحدگی ظاہر ہو جاتی ہے۔)

ضرورت اظہار علیحدگی "میرے کچھ کشمیری دوست جو مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھ سے سوال کر رہے ہیں کہ حکیم صاحب آپ نے سنہ ۱۹۶۲ء سے سنہ ۱۹۶۲ء تک کشمیر میں اہل حدیث پلیٹ فارموں سے جماعت اسلامی کی تعریف و توصیف میں بہت کچھ کہہ ڈالا۔ ان کے کاموں کو آپ ہر طرح سے سراہتے رہے جس کا اثر ہماری غریب جماعت پر یہ پڑا کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے متحرک اور فعال بہت سے نوجوان ہمارے اس پلیٹ فارم کو چھوڑ کر جماعت اسلامی سے جا ملے اور اس

طرح ہماری جماعت کو ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔

"لیکن معلوم نہیں کن اسباب کی بنا پر کچھ دنوں سے آپ جماعت اسلامی کی الیکشنی سیاست کو سراسر غیر اسلامی۔ غیر اخلاقی اور غیر انسانی قرار دے رہے ہیں"۔ (ص۵)

ہمارے احباب کے ذہنوں میں اس وقت بڑا اضطراب برپا ہے۔ اور ہم مسلسل یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیسا انقلاب ہے؟" (ص۶)

دور سر گرمی

برادران محترم! سنہ ۱۹۶۲ء ہی سے نہیں بلکہ سنہ ۱۹۴۷ء ہی سے میں "جماعت اسلامی" اور "جماعت تبلیغی" سے اچھی طرح متعارف ہوں۔ رحمانیہ دہلی میں تعلیم کے دوران ہی میں نے ان کی کتابوں کا مطالعہ کر لیا تھا۔

بھائی آپ کی معلومات اس سلسلے میں زیادہ نہیں ہیں۔ صرف میں نے اتنا ہی نہیں کیا، بلکہ ہزاروں کی تعداد میں اہلحدیث نوجوانوں کو جماعت اسلامی سے متاثر و متعارف کر دیا۔ اور ان میں بہتیرے تو اس جماعت کے ارکان بھی بن گئے"۔ (ص۶)

"کبھی بحث چھڑ گئی تو خم ٹھونک کر وکالت کرنے بیٹھ گیا"۔ "خطاب بہ مودودی" جیسی کوئی سطحی کتاب پیش کی گئی تو اٹھا کر پھینک دیا (کتاب کو پھینک دینا تو غیر معقول جذباتی تعبیر ہے۔ رومی) اور کہہ دیا کہ بس آپ کے پاس جماعت اسلامی کے خلاف اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ معقول اور ٹھوس اعتراضات اس جماعت کے خلاف تو آپ مجھ سے زبانی سن سکتے ہیں لیکن کسی کے کام میں چند قابل اعتراض باتوں کا ہونا جبکہ وہ اصولی اور بنیادی نہوں پورے کام کے غلط ہونے کی دلیل نہیں۔ ان کی تحریک دعوت صحیح ہے۔ دس، بیس یا سو پچاس مسائل غلط بھی ہوں تو مضائقہ

کیا ہے"۔ (ص)

پچھتاوا "لیکن افسوس آج میں اپنے کئے پر پچھتا رہا ہوں اور اپنی جماعت کے بڈھے مولویوں کا دل دکھا کر سخت نادم ہوں ۔ آج میں خود بھی پچپن اور ساٹھ سال کے درمیان کا بوڑھا اور صحت کے لحاظ سے انتہائی کمزور ہوں ۔ بصارت بھی چند سالوں سے بہت کم ہو گئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ خداوندا! کیا میں اپنی غلطیوں کا ازالہ کر سکوں گا یا شرمندگی و شرم ساری کے ساتھ خدا کو منہ دکھانا پڑے گا ۔ (ص)

اسلامی سیاست یا سیاسی اسلام مجھے تو آج جماعت اسلامی، جموں و کشمیر و جماعت اسلامی پاکستان کے موجودہ سیاسی ڈراموں پر حیرت ہے کہ دونوں جگہ کس طرح شریعت اسلامیہ نیز خود اپنے وضع کردہ مسلمہ اصولوں کی دھجیاں بکھیری گئی ہیں۔ بھلا ایک با اصول دینی جماعت کا ایسی جماعتوں کے ساتھ اتحاد جو اس کے مقاصد اور طریق کار سے پوری طرح متفق نہ ہوں؟ ۔ ایسا کرنا صرف سیاسی مقصد سے تو ہو سکتا ہے۔ لیکن دین، روحانیت اور اخلاق کے مقصد کے لئے تو یہ سراسر زہر ہے۔ (ص ۱۰۹)

کیا اب ہم ہمیشہ نماز ہی پڑھتے رہینگے جماعت اسلامی جموں و کشمیر کا تو عجیب حال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی جماعت اسلامی سیاست ہی کو عین اسلام سمجھتی ہے۔ جماعت اسلامی کشمیر کے ایک اعلیٰ درجہ کے ذمہ دار سے ملاقات ہوئی ۔ تو میں نے کہا کہ آپ لوگ کس نجاست میں (الیکشن) کودنے کی تیاریاں کر رہے ہیں ۔؟ اسلام کی تبلیغ اور عوام کی روحانی و اخلاقی اصلاح کے کام پر بس کیوں نہیں کرتے؟ فرمانے لگے تو کیا اب ہم ہمیشہ نماز ہی پڑھتے رہینگے؟ اللہ اکبر! یہ ہے

آج اس جماعت کے ذمہ داروں کا لب ولہجہ "کیا اب ہم ہمیشہ نماز ہی پڑھتے رہینگے؟

پہلا موقف کیا تھا

کبھی جماعت اسلامی کا وہ پہلا موقف کہ ارکان اور ہمدردان کو باقاعدہ طور پر ہدایت کی جاتی تھی کہ اسلام کی دعوت جماعت کے نام سے نہ دیں۔ اور نہ جماعت کی طرف دعوت دی جائے بلکہ صرف اسلام اور قرآن وسنت کی طرف دعوت دی جانی چاہیے۔ اور آج اس وقت کا یہ انقلاب، کہ جاجا کر مسلمانوں سے اسلام، قرآن اور خدا ورسول کے نام پر الیکشن جیتنے کے لئے ووٹ مانگے جاتے ہیں۔" (صـ۱۲)

کتابی تعلیمات اور موجودہ اعمال میں تضاد

"کتابوں میں یہ موقف ہو کہ غیر اسلامی اور لادینی (سیکولر) دستور کو مان کر الیکشن لڑنا درست نہیں۔ اور عمل اس کے بالکل برعکس ہو کہ اسی سیکولر آئین کے لئے حلف وفاداری اٹھانا اور قرآن واسلام کے نام پر ووٹ مانگنا اور یہاں تک کہنا کہ اگر ہمیں ووٹ نہ دیا تو یہ خدا ورسول سے غداری ہوگی۔ کیونکہ ہمیں اسمبلی اور پارلیمنٹ میں جاکر خدمت اسلام کرنا ہے۔" (صـ۱۲)

یہاں تک نوبت پہنچ گئی

"جماعت اسلامی کا لٹریچر اس حقیقت سے لبریز ہے کہ طاغوت کی اطاعت اور اسکے وضع کردہ آئین وقانون کو تسلیم کرنا سراسر شرک ہے۔ نظام باطل سے تعاون کرنا اور اس کے کل پرزے بننا شان ایمان کے منافی ہے۔ اور آج جماعت اسلامی اس بنیادی عقیدہ کی دھجیاں اڑاتی اور سیکولر آئین کے صنم اکبر کو سجدہ کرتی ہوئی عملی سیاست کے میدان میں کود پڑی ہے۔ اور ماشاءاللہ ان .... کو اس بات کا کھلا اعتراف بھی ہے کہ ہاں اس سلسلے میں کچھ غلطیاں ہم سے ضرور سرزد

ہوتی ہیں چنانچہ عاشق کاشمیری جو جماعت اسلامی جموں وکشمیر کے ایک رکن ہیں۔ اپنے مضمون "درجواب آن غزل" میں لکھتے ہیں کہ "تاریخ وتجربہ بھی بتلا رہا ہے کہ مکمل ناپاکی کو دور کرنے کے لئے تھوڑی سی گندگی پر اترنا پڑتا ہے۔ مکمل ناپاکی کے خاتمہ کے لئے تھوڑی سی ناپاکی سے جسم کا آلودہ ہونا قدرتی ہے"۔ (اخبار اذان سرینگر ۱۸ رمئی ۱۹۷۸ء) (ص ۱۲۶)

اس سے پہلے جماعت اسلامی سیاست کی بات کیا کرتی تھی یعنی وہ سیاست جو اسلام کے مقصد کے لئے اپنائی جائے اور اسکے لئے ضروری تھا کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے جو ذرائع استعمال کیے جاتے وہ سراسر دینی واخلاقی ہوتے کیونکہ اسلام وقرآن کی رو سے کسی مقصد صحیح کے لئے بھی غلط اور باطل ذرائع کا استعمال سراسر باطل اور غلط ہے"۔ (ص ۱۴)

"جماعت اسلامی" سیاست

سیاست کیلئے دین کی ہمہ گیری کا بہانہ

کے اس گورکھ دھندے" میں اپنی ٹانگ پھنسانے کے لئے دین اسلام کی ہمہ گیری کا بہانہ اختیار کرتی ہے؛ وہ یہ کہتی ہے کہ دین زندگی کے تینوں شعبوں (انفرادی، معاشرتی اور سیاسی) کو حاوی ہے۔ اور احکام شریعت تینوں شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دین وشریعت بنئے کی دوکان کا سودا نہیں کہ کچھ لے لیا اور کچھ چھوڑ دیا۔ یا سب کو ماننا ہوگا یا سب کو چھوڑنا پڑے گا۔ لہذا پوری شریعت اسلامیہ پر عمل کرنے کیلئے زندگی کے تینوں شعبوں میں داخل ہونا ضروری ہے۔ ——— میں کہتا ہوں کہ مودودی صاحب کے ان قیاس کے تین مقدموں میں سے صرف پہلا مقدمہ بالکل صحیح اور پچھلے دو بالکل غلط اور باطل ہیں۔ لہذا اس قیاس سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے سیاست بھی دین کا ایک حصہ ہے بالکل غلط اور مہمل ہے"۔ (ص ۱۵)

دراصل مولانا مودودی صاحب

مودودی صاحب کی بنیادی غلط فہمی

کی سیاسی غلط فہمی کے بنیادی اسباب صرف، تین ہیں۔ کل دین کا تصور، دین و دنیا کے فرق کا واضح نہ ہونا۔ ربوبیت الوہیت اور عبادت، و اطاعت، کی حقیقت کا واضح نہ ہونا۔

——— مولانا مودودی صاحب نے اپنی کتابوں میں جابجا تحریر کیا ہے " دین اسلام ایک ہمہ گیر نظام ہے۔ یہ دوسرے ادیان کی طرح پوجا پاٹ کے چند رسمی، عبادات کا نام نہیں ہے۔ کہ جنہیں عبادت خانوں میں جاکر بجالایا جائے۔ اور پھر وہاں سے نکل کر جیسی خواہش اور مرضی ہو زندگی بسر کی جائے یہ تو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی اور محیط نظام ہے۔ ان کی یہ بات سو فیصدی صحیح اور درست ہے ———

——— مولانا اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی فرماتے ہیں کہ" یہ کوئی بنیے کی دکان کا سودا نہیں ہے کہ جو سودا چاہا اور جتنا چاہا لے لیا اور جتنا چاہا چھوڑ دیا۔ ایسا کرنا دین کے بعض حصہ پر ایمان لانا اور بعض کا کفر کرنا ہے۔ یا پورے کا پورا سودا لینا ہوگا۔ یا سب کا سب چھوڑنا پڑے گا ——— یہ بات سو فیصدی غلط اور باطل اور خلاف کتاب و سنت ہے۔ اسکے بجائے کتاب و سنت کی روسے صحیح بات یہ ہوگی کہ " مسلمان کی دینی ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ اس کا تعلق جس خاص شعبۂ زندگی سے ہے صرف اس سے متعلق دین و شریعت کے تمام احکام کی بقدر استطاعت بجاآوری اس پر لازم ہے۔ باقی کچھ بھی لازم نہیں "۔ (صد ۲۳)

" سیاست بھی ویسا ہی انسانی زندگی کا ایک شعبہ جیسے تجارت، زراعت ملازمت، صنعت وغیرہ اسلام کے ہمہ گیر نظام زندگی ہونے کا یہی تقاضا ہے۔ کہ مولوی حضرات سیاست میں بھی دخل دیں تاکہ اسلامی اصولوں کو زندگی کے اس شعبہ میں، برتا اور عمل میں لایا جاسکے تو پھر حضرات اسلام کی ہمہ گیری، کے اس تقاضے

کو زندگی کے دوسرے شعبوں میں جاری کرنے کی عملی کوشش کیوں نہیں کرتے ......

...... قرآن و سنت کے جملہ احکام کی تعمیل کیلئے بیک وقت زراعت تجارت و ملازمت، صنعت، محنت، سیاست سارے ہی کاموں کو انجام دینا چاہیئے۔ تاکہ پورے دین پر عمل ہو سکے۔ کیونکہ مودودی صاحب کی جماعت کا اسلامی لٹریچر جگہ جگہ ایسی تصریحات سے بھرا پڑا ہے کہ اسلام کوئی بنیئے دوکان کا سودا نہیں ہے۔ کہ کچھ لے لیا کچھ چھوڑ دیا۔ بلکہ یا تو پورا کا پورا لینا ہے یا کل چھوڑنا ہے۔

خدا مودودی صاحب پر رحم کرے

"یہ ان کی اسلامی فکر و نظر کی سب سے بڑی اور سنگین غلطی ہے، ہرگز یہ منشاء قرآن و اسلام نہیں۔" (صہ ۲۱)

دنیا کے دار العمل اور دار التکلیف سمجھنے میں غلطی

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جب قوت و استطاعت نہ ہو تو اس کے حصول کیلئے کوشش و عمل تو کرنا چاہیئے یا صرف حجرے میں بیٹھے بیٹھے تسبیح و ذکر اور دعاؤں سے قوت حاصل ہو جائے گی۔ اور جب کوئی عمل ہی نہ کیا جائے تو پھر عدم استطاعت کا عذر کیا معنی رکھتا ہے۔؟ آخر یہ دنیا دار العمل اور دار التکلیف ہے۔ یا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خدائی انعامات کے انتظار کی جگہ ہے؟ ―――― بجا ارشاد ہے مولانا بجا ارشاد!

لیکن یہ دار العمل ایسا ہی ہے جیسا آپ سمجھ سکیں۔ پہلے ذرا یہ فرمایئے کہ کون سا عمل ہے؟ عمل سے آپ کی مراد کیا ہے؟ دینی یا دنیاوی، کھیتی، ملازمت، تجارت، صنعت اور سیاست یہ سب عمل ہیں تو ہیں؟ مگر دنیاوی عمل ہیں۔ اخروی ان میں ایک بھی نہیں

ہے۔ ان میں سے ایک بھی انسان کی پیدائش کا مقصد نہیں۔ کسی ایک کے لئے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا گیا۔؟ کوئی کتاب ان کاموں کے ترغیب کے لئے نازل نہیں کی گئی لیکن افسوس کہ جو خالصۃً دینی عمل ہے، تسبیح، ذکر، تلاوت اور دعا ان کاموں کو تو آپ اپنے عمل کی فہرست سے نکال دیتے ہیں۔ اور یہ گویا جماعت اسلامی کا مذاق بن چکا ہے کہ سیاست کے سنڈاس میں پورے افراد معاشرہ کو گھسیٹنے کے لئے خالص دینی چیزوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اقبال کا یہ شعر اکثر ان حضرات کو طنزاً پڑھتے سنا گیا ہے ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

——— جن ناقص اعمال کے چکر میں پھنس کر آپ خدا کی گراں قدر نعمتیں حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کی خدا کی نگاہ میں قیمت بھی تو لگے تب تو صلہ ملے گا۔ اور جن کو آپ سرے سے اعمال ہی نہیں سمجھتے۔ بلکہ تعطل، کاہلی، بزدلی اور "راہبانہ زندگی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا صلہ دیکھنا ہو تو ذرا اس آیت پر غور فرمایئے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

(جب بھی زکریا (علیہ السلام) مریم کے پاس محراب میں داخل ہوتے تو ان کے پاس روزی کا سامان پاتے اور پوچھتے۔ مریم! تمہیں یہ کہاں سے مل گیا تو کہتیں خدا کے پاس سے بیشک اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے)

——— آپ اپنے اس سراسر لغو اور بے کار سیاسی عمل کے نتیجہ میں دنیا کا ایک چپہ ہی حاصل کر کے دکھایئے۔ (صد ۲۳)

دین و دنیا کی تعیین میں غلطی اور ٹھوکر

مولانا مودودی صاحب کے سیاسی اسلام میں "غلط فہمی" کی دوسری بڑی بنیاد دین اور دنیا کا اختلاط و التباس ہے۔ بعض آیات و احادیث کے مفہوم سمجھنے میں انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ اور دین و دنیا کے فرق کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی مصیبت ان کے سسٹیمٹک اسلام کا تصور ہے

——— وہ کہتے ہیں کہ جیسے ایک گھڑی یا کوئی دوسری چھوٹی یا بڑی مشین اپنے تمام چھوٹے بڑے کل پرزوں کے تعاون و تعامل سے چلتی ہے اور اگر درمیان سے ایک معمولی پرزہ بھی کھسک جائے اور اپنا عمل بند کر دے تو پوری مشین بیکار اور معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اسلامی زندگی بھی ہے۔ یہاں بھی درمیانی خلا اور انقطاع عمل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ پورا ایک نظام ہے اور اسے ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا و آخرت کا فرق محض اعتباری و اضافی شے ہے۔" (ص۷۹)

اس سلسلے میں ان کی بعض باتیں تو کسی معقول تاویل و توجیہ کے ساتھ صحیح تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ لیکن وہ تاویلات جن سے وہ "سسٹیمٹک اسلام" کا نظریہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حدیث و قرآن کی روشنی میں قطعی باطل اور غلط ہیں۔ (ص۸۰)

——— قرآن میں اگر کوئی تصنیفی نظم و ترتیب تلاش کرتا ہے۔ تو یہ اسکی غلطی ہے۔ یہ تو منشور شاہی ہے۔ اس کا نظم تصنیف و تالیف کے نظم سے بالکل جدا ستاروں جیسا ہے۔ اسی طرح اسلام جب خدائے علیم و حکیم کا نازل کیا ہوا دین ہے بے نظم و ترتیب کیونکر ہو گا۔؟ لیکن حضرت مولانا مودودی صاحب کو اس "نظم اسلام کا نرخ" کب خدا نے بنا دیا ہے کہ جو کچھ وہ چاہیں اور جس طرح چاہیں ترتیب دیکر امت کے سامنے پیش کر دیں۔ قرآن و سنت نے خود اسلام کے

فطری نظام کی تشکیل کردی ہے۔ اس میں مودودی صاحب کے مصنوعی نظم و ترتیب کی طرف دعوت دینا ایک "بدعت سیئہ" ہے" (ص ۸۱)

دین اسلام کا فطری نظم وہی ہے۔ جو کتاب شریعت کے اندر موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہے۔ آپ کے بعد خلفاے راشدین و صحابہ کرام پھر تابعین اور تبع تابعین اور ائمہ سلف سب اسی فطری نظم کے قائل تھے یہ جسارت کسی ایک نے بھی نہیں کی کہ اسلام کے فطری نظم کو بدل کر مصنوعی مشینی نظم پر اس کی از سر نو تنظیم کرے"۔ (ص ۸۲)

مولانا مودودی صاحب۔ کا سسٹمیٹک

مودودی صاحب کا سسٹمیٹک اسلام

اسلام پوری انسانی معیشت۔ کو کھینچ کر دین اسلام کی حقیقت میں داخل کر دیتا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص جتنا بڑا دنیادار ہوگا وہ اتنا ہی بڑا دیندار بھی ہو سکے گا اور جو شخص اس دنیاداری سے جتنا بے بہرہ اور لاتعلق ہوگا اسی کے بقدر وہ دین و آخرت سے بھی محروم و بے نصیب ہوگا۔ حالانکہ اکثر معاملہ اسکے برعکس ہوتا ہے۔ مودودی صاحب کا یہ سسٹمیٹک اسلام معاشی اور سیاسی نقطہ نگاہ رکھنے والے ترقی پسند لوگوں کی نظروں میں وقیع تو ضرور ہو جاتا ہے مثلاً یہ خیال ایک دنیادار انسان کے نزدیک بڑا خوش کن ہے۔ اسلام دین و دنیا کا جامع مذہب ہے۔ اس میں رہبانیت اور ترک دنیا کی گنجائش نہیں مگر یہ خیال دنیاداروں کی نظروں میں بھی اسی وقت تک خوش کن ہے۔ جبتک ان کے خود ساختہ اسلام کی اس جامعیت کو مجمل و مبہم رکھا جائے اور اسکی تشریح و تنقیح نہ کی جائے۔ ورنہ جہاں کسی مولوی کی زبان سے یہ بات نکلی کہ اسلام چونکہ دین و دنیا کا جامع مذہب ہے لہذا علماء اسلام جو دوسروں سے زیادہ دین کے سمجھنے والے ہیں وہی سب سے زیادہ دنیا کے سمجھنے اور جاننے

والے بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا پوری انسانی معیشت پر مولویت کا کنٹرول دنیا والوں کو تسلیم کر لینا چاہیئے۔ یہ بات زبان سے نکلی نہیں کہ پورا زمانہ مولویت اور اسکے پیش کردہ اسلام کا مخالف بن جائے گا۔ اور ہر دنیا دار انسان کہنے لگے گا کہ مولوی پوری انسانی معیشت کا استحصال کر رہا ہے"۔ (ص ۱۰۵)

ضرورت ہے کہ ان سیاسی مجاہدین کے عزائم سے پوری دنیائے اسلام کو باخبر کر دیا جائے ورنہ حل وحرم (حرم و بیرون حرم ، عرب و عجم) کا کوئی علاقہ بھی ان کے سیاسی فسادات کی زد سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ سعودیہ عربیہ جیسے ملکوں کو بھی یہ اسلامی ملک تسلیم نہیں کرتے کہتے ہیں کہ چند حدود شرعیہ کے نفاذ سے کیا ہوتا ہے۔ جب کہ وہاں بادشاہت کا نظام قائم ہے، اسلامی جمہوریت نہیں ہے۔ دراصل یہ حضرات کسی ایسی اصلاح کو اصلاح ماننے کیلئے تیار ہی نہیں ہیں۔ جو ان کے علاوہ دوسروں کے ہاتھوں جاری ہو۔ اصلاح بس وہی ہو سکتی ہے۔ جو ان کے ہاتھوں سے ہو اور جب معاملہ ایسا ہو تو پھر کسی بھی حکومت برداشت کرنے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے۔؟

— لیکن یہ مجاہدین سیاست اتنے بڑے بزدل ہیں کہ ہر جگہ اپنے عزائم کے کھلے اظہار کی جرأت بھی نہیں کرتے۔ سعودیہ عربیہ اور کویت جیسے ملکوں میں یہ اپنا تعارف سلفیت (اہل حدیث) کے ساتھ کراتے ہیں۔ آرایس ایس کی ہمنوائی کے لئے حکومت الٰہیہ کا ترجمہ "رام راج" کرتے ہیں"۔ (ص ۱۲۵)

جماعت اسلامی کی رکنیت کے وقت تجدید کلمہ و تجدید ایمان کیوں ہوتی ہے | مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنی کتاب "قرآن کی

چار بنیادی اصطلاحیں" الوہیت، ربوبیت، عبادت و اطاعت کے لغوی اور عرفی معنی کو بیان کرتے ہوئے الوہیت کولازمۂ ربوبیت اور عبادت کولازمۂ اطاعت قرار دیا ہے۔ جس کا مقصد اور مدعا یہ ہے کہ جو شخص غیراللہ کی اطاعت کرتا ہے وہ اس کی عبادت کرتا ہے۔ اور اسے رب والٰہ مانتا ہے۔ لہٰذا غیراللہ کی اطاعت کرنے والا" لا الٰہ الا اللّٰہ" کی حقیقت کا منکر ہے۔

مولانا کی یہ کتاب سیاست کو جزو دین اور اسٹیٹ کے تصور کو داخل اسلام قرار دینے کے لئے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنے اسی تصور کی بنا پر تمام "امت مسلمہ کو انہوں نے دین کا محض جزوی خادم اور اپنی قائم کردہ جماعت اسلامی کو کل دین کا علمبردار قرار دیتے ہوئے اپنے اور پوری "امت مسلمہ" کے درمیان اہل اسلام اور یہود و نصاریٰ کا سا فرق رکھا ہے۔ یعنی جس طرح یہود و نصاریٰ اہل کتاب تو تھے لیکن کتاب اور دین کی اقامت کی بجائے، صرف اس کے بعض مسائل پر جزوی طور پر عمل پیرا تھے۔ یہی حال آج ان کی نظر میں امت مسلمہ کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اسی لئے جماعت اسلامی کی رکنیت قبول کرتے وقت نئے سرے سے تجدید کلمہ کرایا جاتا ہے۔ یعنی دین اسلام کے کلمہ کو دین کے جزوی تصور سے بالاتر ہو کر کل دین کے تصور کی بنیاد پر قبول کیا جاتا ہے"۔

ــــ (صہ ۱۲۸ و صہ ۱۲۹)

جماعت اسلامی مودودی صاحب کی اندھی مقلد بن کر رہ گئی!

"آج جماعت اسلامی کا حال یہ ہے کہ نصف صدی کے اندر ہی صحابہ اور ائمہ سلف تک کی تقلید سے اعلان برائت کرتی ہوئی ابھری تھی اور آج صحابہ و ائمہ سلف تو درکنار اپنے

مقتدی و پیشوا مودودی صاحب کی اندھی مقلد بن کر رہ گئی ہے۔ اور اندھے پن کی یہ حد ہے کہ ائمہ سلف کی تقلید تو صرف فروعی مسائل میں روا رکھی گئی ہے اصول دین اور عقاید میں تقلید امام کو ہر شخص ناجائز و حرام سمجھتا ہے۔ لیکن مولانا مودودی صاحب کے اندھے مقلد اصول دین اور ایمان و اعتقادات کے بارے میں گویا ان کی تقلید کو فرض قرار دے چکے ہیں۔ (ص ۱۲۵ و ص ۱۲۶)

یہ سب مکر و فریب تھا

اگر جماعت اسلامی کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ مٹھی بھر جماعت جو مختلف الخیال اور مختلف المسلک افراد پر مشتمل تھی ملت اسلامیہ کے مردہ جسم میں اسلامی اور ایمانی زندگی کی ایک روح ڈالنے کے لئے منظم ہوئی تھی۔ یہ جماعت اس وقت بھی اسلامی سیاست کا نام لیتی تھی لیکن اس وقت اس کے طرز عمل سے اس کے موجودہ طرز عمل کا اندازہ کرنا ایک بے بنیاد سوء ظن کی حیثیت رکھتا تھا

اس وقت بھی جماعت کے قائدین طرح طرح کی پیشین گوئیاں کرتے تھے اور کہتے تھے آئندہ چل کر یہ جماعت مجددیت اور مصلحیت کے ویسے ہی دعوی کرنے لگ جائے گی۔ جیسا کہ غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرووں نے کیا ہے۔ لیکن ایسی پیشین گوئیاں ہر شخص کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھیں۔ (ص ۲۷۱)

"ایک مدت تک اس جماعت کے ارکان و ہمدردان کے لئے یہ پابندی تھی کہ وہ نہ تو غیر جماعت کے جلسوں میں شرکت کر سکتے تھے اور نہ ان کے پلیٹ فارموں سے خطاب کر سکتے تھے۔ اور اس وقت اس کی توجیہ یہ کی جاتی تھی کہ اس طرح مقصد کا صحیح تعین نہیں ہو پاتا۔ لہذا جن مسلمانوں

کا مقصد محض نمائشی جلسہ آرائی ہے۔ یا دین خالص کے علاوہ ٹوٹے پھوٹے رائج الوقت دین کی اشاعت ہے۔ ہم ان کے ساتھ کسی قسم کا عملی تعاون اور ہمنوائی نہیں کر سکتے۔

۱۹۶۹ء کی بات ہے کہ میں ان دنوں مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں معلم تھا۔ سالانہ جلسہ ہوا۔ مولانا ابوالوفا فصیحی غازی پوری کی تقریر تھی۔ میں اور میرے ساتھ چند طلبا و اساتذہ جو جماعت اسلامی کے رکن تھے تقریر سننے کے لئے چلے گئے۔ دوسرے دن جماعت کی ہفتہ وار نشست میں ان سے اس کی باقاعدہ بازپرس ہوئی۔ کہ جماعت کے ارکان ہو کر انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ (ص ۲۶۹)

" جماعت سازی کا طریقہ اتنا تنگ

جماعت کی رکنیت کا معیار

اور چست تھا کہ آج کے رکن رکین پروفیسر عفور احمد جیسے ڈاڑھی منڈوں کی بات ہی نہ تھی بڑے بڑے متشرع اور متدین و متقی لوگ مہینوں اور برسوں امیدوار رکنیت بن کر جوتے چٹخاتے رہتے تھے۔ اور ان کا بار بار جائزہ لیا جاتا تھا۔ کہ ابھی جماعتی مزاج پیدا نہیں ہوا ہے۔ .... یہ جماعتی مزاج صوفیوں اور مرشد پیروں کے بیعتی مزاج سے بھی سخت تر معیار کا نام تھا۔ کتنے امیدوار تو اسی' امید میں جاں بحق ہو گئے لیکن ان تھک کوششوں کے باوجود جماعتی مزاج پیدا نہ کر سکے۔

یہ کون سی معجون مرکب تھی جس کا مزاج اتنی پیچیدگی اور دشواری کے بعد تیار ہوتا تھا؟ اس وقت تو یہی کہا جاتا تھا کہ دراصل ہم کوئی نئی امت اور جماعت تو بنانے جا نہیں رہے ہیں کہ ہر خواہشمند کو کلمہ پڑھا کر جماعت میں

داخل کرلیں۔ آج کلمہ تو ساری امت پڑھ رہی ہے۔ لیکن قرآن و سنت والا اسلام و ایمان اور تقویٰ کہاں ہے۔؟ لہٰذا ہم تو پوری امت کے سامنے معیاری، عملی و اعتقادی نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ مخالفین اسلام کو دکھا سکیں کہ آج بھی صحیح اسلام اپنی عملی شکل میں موجود ہے۔ اور اس کا نمونہ یہ جماعت ہے۔ــــــــ

لیکن اب وقت گذرنے اور حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ دراصل مزاج کی بات یہ نہ تھی جو وہ کہا کرتے تھے بلکہ کچھ اور تھی اور وہ مزاج جس کا جائزہ امیدوار رکنیت میں لیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ آیا امیدوار رکنیت آئندہ چل کر اس سیاسی کشمکش کے کھیل کے لئے پوری طرح تیار ہو چکا ہے۔ یا نہیں جسے جماعت کے اسٹیج کام کے بعد مودودی صاحب اور ان کے نائبین کھیلنا چاہتے تھے۔ اور یہ جائزہ اس درجہ ہوشیاری کے ساتھ لیا جاتا تھا کہ امیدوار یہ بھانپ نہ سکے کہ اس میں جو جماعتی مزاج تلاش کیا جا رہا ہے وہ کس چیز کا نام ہے؟ــــ

ــــــــ طریق کار یہ تھا کہ کتابیں پڑھنے کو دے دی گئیں اور ہمدرد جماعت کی حیثیت سے ہفتہ وار اجتماعات میں شرکت ضروری قرار دے دی گئیں۔ چند کتابیں ختم کرنے کے بعد کتابوں کا ایک اور بنڈل مطالعہ کے لئے دے دیا گیا۔ ادھر ارکان ہمدردان کے ساتھ ملاقاتوں اور بات چیت کے ذریعے مسلسل جائزہ لیا جاتا رہا۔ اور اسکی باقاعدہ رپورٹ امیر جماعت و قیم کو پہونچائی جاتی رہی۔ اس طرح امیر و قیم امیدوار کی خامیوں سے پہلے ہی سے باخبر ہوتے اور جب امیدوار امیر جماعت سے رکنیت کے قبول کرنے کا مطالبہ کرتا تو چاہئے اور

ناشتہ کی نشست میں امیر چند سوالات بھی موصولہ رپورٹ کی روشنی میں امیدوار سے کر لیتا۔ اور جب موصولہ رپورٹ کی صحت کی مزید تصدیق ہو جاتی تو سر ہلا کر ایک دل آویز تبسم کے ساتھ حضرت امیر جماعت یہ فرما دیتے،

"ابھی ابھی اور کتابیں پڑھئے ابھی ٹھیک طرح سے جماعتی مزاج پیدا نہیں ہوا"

امیدوار بیچارہ کتابوں کا "بنا بنڈل" بغل میں دبائے ہوئے اپنی کم صلاحیتی پر اشک ندامت بہاتا گھر واپس آجاتا۔

"آج میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں" وہ مطلوبہ مزاج ہرگز خدا پرستی، آخرت پسندی اور کتاب و رسالت کے اتباع کا مزاج نہ تھا بلکہ وہ بھی سیاسی کشمکش کا مزاج تھا"

مدرسۃ الاصلاح پر قیام کے دوران ایسے چند واقعات دیکھنے میں آئے کہ اچھا خاصا ایک متشرع اور متدین انسان جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلے میں اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کے سلسلہ میں اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کی بہت حد تک اصلاح کر چکا ہے۔ اور مسلسل ڈیڑھ دو سال سے رکنیت کے لئے ہاتھ پیر مار رہا ہے۔ تو وہ رکنیت سے اب تک محروم ہے کہ اس میں جماعتی مزاج کا ہنوز فقدان ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل کوئی سیاسی توڑ جوڑ سے واقف انگریزی داں خواہ وضع قطع میں پروفیسر غفور احمد جیسا کیوں نہ ہو امیدوار رکنیت بن کر آیا۔ اور اپنی خداداد صلاحیت سے جماعتی مزاج کے معیار پر پورا اترا اور رکن جماعت بن گیا۔

مزاج سازی کے لئے بار بار اس جماعت کے سیاسی لٹریچر کے مطالعہ پر زور

دیا جاتا تھا۔ کوئی شخص کسی دینی درسگاہ سے باقاعدہ فارغ التحصیل کیوں نہ ہو
اور خواہ وہ اپنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے کیسا ہی لائق و فائق کیوں نہ
نہ ہو جب تک مولانا مودودی کا لٹریچر نہیں پڑھ لے کسی گنتی شمار میں نہیں سمجھا
جاتا تھا اور اگر کسی نے اپنے ذوق کے مطابق ان کے لٹریچر کا وہی حصہ پڑھا ہوتا
جو صرف دینی مسائل پر مشتمل ہے۔ تو یہ مطالعہ بالکل ناکافی اور غیر ضروری سمجھا
جاتا تھا۔ اور باقاعدہ اسے روئیداد کے تمام حصے اور سیاسی کشمکش اور قرآن
کی چار بنیادی اصطلاحیں وغیرہ جیسی کتابیں پڑھنے کی ہدایت کی جاتی تھی
ترجمان القرآن بابت جون جولائی اگست ۱۹۴۱ء

(**اضافۂ مرتب** :- میں جماعت اسلامی کے پہلے اجتماع کی روداد میں
علامہ مودودی نے جو ہدایات جاری فرمائی ہیں اسکی ہدایت ہے ہیں وہ خود فرماتے
ہیں :— ۔ جو شخص جماعت اسلامی میں داخل ہو اسکو تحریک اسلامی
کے لٹریچر کا بیشتر حصہ پڑھوا دیا جائے۔ (اور یہ بیشتر حصہ مخصوص اہل راز کو
ہی معلوم تھا کہ کیا پڑھوانا ہے۔ اور کیا نہیں۔) تاکہ وہ اس تحریک کے تمام پہلوؤں
سے واقف ہو جائے اور تحریک کے ارکان میں ذہنی و عملی ہم آہنگی پیدا
ہو سکے اس معاملے میں کبھی کسی کے متعلق یہ فرض نہ کر لیا جائے کہ وہ پہلے ہی
سے سب کچھ سمجھتا ہو گا۔ اگر اس مفروضہ پر ایسے لوگوں کی بڑی تعداد جماعت میں
داخل کر لی گئی۔ جو اس تحریک کے لٹریچر پر نظر نہ رکھتے ہوں تو اندیشہ ہے کہ جماعت کے
ارکان ایک دوسرے سے متضاد باتیں اور متضاد حرکات کرینگے۔ (علامہ کا یہ مفروضہ
بھی سراسر وہمی و فرضی تھا۔ اور محض لٹریچر کی تبلیغ کے لئے یہ "خیالی ہوا" تیار کر لیا گیا تھا مرتبہ)

رکنیت کی کارروائی :- خمیرہ آبریشم و خمیرہ گاؤزبان کے مانند اچھی طرح گھوٹنے
کے بعد جب امیر جماعت یہ فیصلہ کر لیتا کہ اب امیدوار

کی درخواست رکنیت قبول کرلی جائے تو ہفتہ وار میٹنگ میں جو عام طور پر بعد نماز عصر صحن مسجد میں ہوتی تھی اور جس میں مقامی ارکان و ہمدردان کی ایک خاصی تعداد امیر جماعت کے گرد حلقہ باندھ کر نہایت ادب و احترام کے ساتھ تشہد کی حالت میں بیٹھتی تھی اسی حلقہ میں یہ نیا امیدوار رکنیت امیر جماعت کے روبرو تشہد کی حالت میں بیٹھ جاتا تھا۔ اس وقت اس پوری مجلس پر احساس خوف اور خوف و خشیت کی عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ حضرت امیر جماعت ایک مختصر سی تفکر آمیز خاموشی کے بعد آہستہ آہستہ بڑے درد و رقت کے ساتھ خطبۂ مسنونہ پڑھ کر کوئی مختصر سی آیت تلاوت فرما کر ٹھہر ٹھہر کر مختصر سی تقریر فرماتے جس میں احساس فرض اور آخرت میں خدا کے سامنے جوابدہی پر کافی زور دیا جاتا پھر امیدوار سے تجدید کلمہ اور تجدید ایمان کرایا جاتا تھا ——— بعض امیدواروں پر رقت و گریہ کی عجیب کیفیت طاری ہو جاتی اور ان میں سے بعض تو سر سے پیر تک لرزتے دیکھے جاتے تھے۔ اس کے بعد جناب امیر صاحب امیدوار اور جملہ حاضرین دست دعا دراز کرتے اور امیدوار کے لئے ثبات و استقامت کی دعا کی جاتی

اس طرح پر ایک ایک امیدوار کو "حلقہ بگوش" جماعت کیا جاتا تھا۔

لیکن آج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب محض مکر و فریب تھا

اور اس وقت کی یہ کاوش آئندہ کوئی سیاسی دھماکہ

کرنے کیلئے ایٹمی اجزاء کی محض فراہمی تھی۔

عرض مرتب :- جناب مولانا حکیم عبید اللہ خاں صاحب کے یہ تاثرات

ان کی کتاب " اسلامی سیاست " یا " سیاسی اسلام سے ماخوذ ہیں ۔

موصوف کی یہ کتاب تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے ۔ جو اسلامک پبلیکیشنز سرینگر کشمیر سے شائع ہوئی ہے ۔

یہ کوئی مستقل اور مربوط تصنیف نہیں ہے ۔ بلکہ موصوف کے قسط وار لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے ۔ راقم السطور نے کوشش کی ہے کہ موصوف کی اس مفصل اور غیر مسلسل تحریر سے بطور اختصار بغیر کسی اصلاح و ترمیم کے خود انہیں کی عبارات و الفاظ میں اس کا خلاصہ پیش کر دیا جائے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مجھے اس معاملے میں کچھ کامیابی ہوئی کہ نہیں ۔ ؟

تاہم امید ہے کہ ناظرین کو اس سے بھی " جماعت اسلامی " کا اصلی روپ دیکھنے میں یقیناً مدد ملے گی ۔

عبدالقدوس رومی
مفتی شہر آگرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آپ بیتی

جماعت سے علیحدگی کا سبب؟

مریضانہ ذہنیت اور دین کی سیاسی تعبیر

(از: جناب وحید الدین خانصاحب (مصنف "تعبیر کی غلطی")

"مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک بار "ایک مریضانہ ذہنیت" کی نشاندہی فرمائی تھی جس سے مراد یہ ہے کہ اپنے اپنے صالحین تک "متنقید نہیں ہیں" (صدق جدید ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء) مجھے مولانا مودودی کے خلاف زبان کھولنے کے بعد خصوصیت سے اس مریضانہ ذہنیت کا تجربہ ہوا۔ (خانصاحب موصوف کے اسی خصوصی تجربہ کے باعث احقر مرتب نے اس "آپ بیتی" کا عنوان "مریضانہ ذہنیت" پسند اور تجویز کیا ہے۔ رومی) مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کے لئے جو دستور وضع کیا تھا اس کے عقیدہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ــــ "کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے" ــــ اس عقیدہ کا استعمال جب تک میں دوسروں کے اوپر کرتا رہا جماعت کے حلقہ میں بڑی خوب واہ واہ ہوئی اور جب میں نے اس کا استعمال مولانا مودودی کے خلاف کر دیا تو اس طرح بڑی دار و گیر شروع ہو گئی گویا میں ممنوع حد کے اندر داخل ہو گیا ہوں۔ شاید عقیدہ کی یہ دفعہ دوسروں پر تنقید کرنے کے لئے تھی۔ "خود" واضع دستور کیلئے نہ تھی۔" (دین کی سیاسی تعبیر صہ ۳)

"مولانا جس نظام خلافت کے احیاء کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق اس کی آٹھ خصوصیات میں سے چوتھی اہم خصوصیت یہ ہے کہ تنقید کرنیوالے کو معقول جواب دیکر مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ہمت افزائی کی جائے

اور اسکو تحسین و آفرین سے نوازا جائے۔ اس کے برعکس دور ملوکیت کا خاصہ یہ ہے کہ تنقید کرنے والے کو دبایا جائے۔ اسکو ڈانٹ اور دھمکی سے خاموش کیا جائے اور اسکے باوجود اگر وہ زبان کھولنے سے باز نہ رہے تو کوڑے اور جیل کی منطق سے اس کا علاج کیا جائے۔ (دین کی سیاسی تعبیر ص۵)

مولانا مودودی کی اس تشریح کو ذہن میں رکھئے اور اس کے بعد ـــــ اس واقعہ کو یاد کیجئے جو میرے ساتھ پیش آئے۔ اس وقت میں جماعت اسلامی کا ایک رکن تھا۔ مجھے مولانا مودودی کی تحریروں کے بارے میں بعض اعتراضات پیدا ہوئے۔ دسمبر سنہ ۱۹۶۱ء میں میں نے اپنے خیالات قلمبند کر کے مولانا کی خدمت میں روانہ کئے اس کا جواب مجھے کیا ملا۔ مولانا خلافت کے نظام کے احیاء کے علمبردار ہیں۔ اس لئے اس تنقید و اعتراض کا ردعمل بظاہر یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ اسکو میرا حق نہیں بلکہ فرض سمجھتے وہ سمجھتے کہ یہ میرے ضمیر کی زندگی کا ثبوت ہے۔ وہ میری ہمت افزائی کرتے معقول جواب دیکر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے حتی کہ مجھے تحسین و آفرین سے نوازتے (ص۵) مگر ہوا کیا؟ میں اپنی کتاب "تعبیر کی غلطی" میں وہ دو سالہ خط و کتابت شائع کر چکا ہوں۔ جو اس سلسلے میں میری مولانا مودودی سے ہوئی۔ اس میں کوئی شخص بھی دیکھ سکتا ہے کہ مولانا نے میری بات کا تو مطلق کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اپنے دائرہ کے اعتبار سے اس قسم کا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے کہ جسکو وہ ملوکیت کا خاصہ قرار دیتے ہیں۔

مولانا نے کیوں مجھے جواب دیکر مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کی اسکو مولانا کے اپنے الفاظ میں مرتب کیا جائے تو وہ حسب ذیل ہوگا۔

- آپ کا مطالعہ نہایت ناقص ہے۔ مزید غضب یہ ہے کہ آپ اپنے کو ایک بہت اونچے مقام پر فائز سمجھ کر کلام فرمارہے ہیں۔ میری مشکل یہ ہے کہ علم کی کمی کے ساتھ جو شخص اسی طرح کے زعم میں مبتلا ہو اس سے مخاطب ہونے کی مجھے عادت نہیں ہے۔ (ص۱۶۴)

- آپ اس مقام سے گذر چکے ہیں جہاں آپ کو سمجھانے کی کوشش مفید ہو سکتی تھی۔" (صہ ۱۶۵)
- آپ کے اندر سخت ۔۔ زعم اور ادعا پیدا ہو چکا ہے۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آپ کے اندر احتساب نفس کی صلاحیت باقی ہے یا نہیں۔" (صہ ۱۶۸)
- آپ اتنے بلند اور بعید مقام پر پہنچ چکے ہیں کہ اب آپسے گفتگو غیر ممکن اور لاحاصل ہے۔ (صہ ۱۸۳)

اس طرح مولانا مودودی نے ساری خط وکتابت میں میری کسی بات کا قطعاً کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ میرے اوپر طرح طرح کے حکم لگاتے رہے۔ جب میرا اصرار بہت بڑھا تو آخر میں انہوں نے لکھ دیا کہ آپ اپنے خیالات شائع کر دیجئے۔" میرے کرم فرماؤں کی فہرست پہلی ہی خاصی طویل ہے۔ اس میں آپ کا اضافہ ہو جانے سے کوئی بڑا فرق نہ پڑے گا۔" (صہ ۵۱۵)

مولانا مودودی کے ان الفاظ کو پڑھیے اور اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ ان کی تشریح کے مطابق ان کے اندر" خلافت" کی روح کام کر رہی ہے۔ یا" ملوکیت" کی روح "؟ مولانا خود اپنا مقام تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بلا استثنار کے تمام مجددین امت پر تنقید کریں۔ اس سے آگے بڑھ کر صحابہ کرام کی غلطیوں کی نشاندہی کریں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر خلیفۂ راشد کا احتساب کریں، لیکن خود ان کی ذات پر اگر تنقید کی جائے تو ناقد فوراً ہی اس سزا کا مستحق ہو جاتا ہے۔ جسکو انہوں نے ملوکیت کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ" ملوکیت" با اختیار ہونے کی وجہ سے قید اور قتل اور کوڑوں کی مار تک جا سکتی تھی اور مولانا صرف قلمی سزا دینے کا اختیار رکھتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو مولانا دریا بادی نے" مریضانہ ذہنیت" قرار دیا ہے" دین کی سیاسی تعبیر" میں۔

" مولانا مودودی کی دینی تعبیر کو ایک لفظ میں سیاسی تعبیر

دین کی سیاسی تعبیر کہا جا سکتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ کوئی لفظ خاص

طور پر اصطلاحی لفظ کبھی کسی صورت حال کا مکمل ترجمان نہیں ہوتا ہے ۔ تاہم مولانا مودودی کی تحریروں کے نتیجہ میں دین کی جو تصویر سامنے آتی ہے اسکو ظاہر کرنے کے لئے قریب تر لفظ دین کی سیاسی تعبیر ہی ہے ۔ (ص۱۱)

مولانا نے دین کو ایک جامع تعبیر کی شکل دینے کیلئے جس طرح اسکی تشریح کی ہے ۔ اس میں سیاست کا پہلو اس طرح ابھر آیا ہے کہ وہی پورے مجموعہ کا "مرکزی نقطہ" بن گیا ہے ـــــ سیاست کے بغیر نہ رسالت کا مقصد معلوم ہو سکتا نہ عقائد کی پوری معنویت سمجھ میں آتی ۔ نہ نماز اور عبادات کی اہمیت صحیح طور پر واضح ہوتی نہ تقویٰ اور احسان کے مراحل طے ہوتے نہ معراج کا سفر با معنی نظر آتا غرض سیاست کے بغیر پورا دین اس طرح خالی اور ناقابل فہم رہتا ہے ۔ جیسے مولانا مودودی کے الفاظ میں وہ اپنے تین چوتھائی جزو سے محروم ہو گیا ہو" (ص۱۱)

مولانا کے دعوتی لٹریچر کے سلسلے میں میرا اعتراض یہی ہے کہ انہوں نے دین کے سیاسی پہلو کو اہمیت دینے میں یہاں تک مبالغہ کیا کہ اسکو ایک "تعبیر بنا ڈالا" مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ انہوں نے سیاست کو دین میں کیوں شامل کیا ـــــ میرا اعتراض دراصل یہ ہے کہ انہوں نے سیاسی پہلو کو اتنا بڑھا دیا کہ وہ "دین کی سیاسی تعبیر" تک پہنچ گیا گویا معاش کے مسئلہ نے اپنی واقعی حد سے گذر کر مارکسزم کی صورت اختیار کرلی اور عسکریت کی جائز اہمیت نے آگے بڑھ کر خاکسار پارٹی تک نوبت پہنچا دی ۔ (ص۱۹)

نیز اس برصغیر میں اسلامی سیاست کے احیا کی خواہش میں بھی مولانا مودودی منفرد نہیں ہیں ۔ ہر درد مند مسلمان اور ہر اسلامی گروہ اپنے انداز سے اسکے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے اپنے تصور کے مطابق اسکی کوئی نہ کوئی تدبیر ہر ایک کے سامنے ہے ۔ بلاشبہ حالات کے مطالعہ اور طریق کار کے اختلاف کی وجہ سے ان میں بہت کچھ فرق ہے ۔ مگر کوئی اس تمنا سے خالی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ دن لائے جب اسلام کو غلبہ اور اقتدار حاصل ہو" (ص۱۶)

یہاں تک مختلف اسلامی حلقوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے فرق دراصل وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں سے مولانا مودودی کی مخصوص تعبیر کا آغاز ہوتا ہے یہ فرق اس اعتبار سے نہیں ہے کہ مولانا مودودی سیاست پر زور دیتے ہیں بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ وہ ایک خاص طرح کی ذہنیت پیدا کرتے ہیں جو ہر چیز کو بس سیاست کے رنگ میں دیکھنے لگتی ہے۔" (صہ ۲۰) ______

______ اگر مولانا مودودی یا ان کے معتقدین مارکس کی طرح یہ سمجھیں کہ مولانا نے اسلامی سیاست کے "ناقص" تصور کو مکمل شکل دی ہے۔ تو یہ ایک صحیح بات ہوگی مگر اسی صحیح بات میں مولانا مودودی کی غلطی کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔" (صہ ۲۱)

غلطی کا تعین مولانا مودودی کی غلطی اپنے انتہائی مفہوم میں ان لوگوں سے مشابہ نہیں ہے جو دین کسی جزو کی کمی (مثلاً سنت کا انکار) یا دین میں کسی جزو کی زیادتی (مثلاً نئی نبوت کا دعویٰ) کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ان کی اصل غلطی یہ ہے کہ ان کے ذہن میں دین کا فلسفہ بدل گیا۔ بقیہ خرابیاں جو ان کے یہاں نظر آتی ہیں وہ سب اسی ایک غلطی کا شاخسانہ ہیں ______

______ ان (مولانا مودودی) کے مخصوص ذہن نے سیاست کو دین میں مرکزی مقام دیدیا اور دین کو سیاسی طور پر غالب کرنا۔ ان کو وہ سیاسی نصب العین نظر آیا۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کے سپرد کیا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے تمام اجزا سیاست کے تابع ہو گئے ______ اسی طرح ان کے فکری خانے میں دین کی جو شکل بنی اس میں ہر جزو پر سیاسی رنگ غالب آگیا۔ اور ہر جزو اپنے واقعی مقام سے ہٹ گیا۔ یہ بات مولانا مودودی کے لٹریچر میں اس کثرت سے پھیلی ہوئی ہے کہ کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ (صہ ۲۲ و صہ ۲۳)

نصب العین کا تصور "دین کی سیاسی تعبیر نے اپنے فطری نتیجہ کے طور پر منزل مقصود کا سیاسی تصور پیدا کیا۔ اور ایک ایسا

نصب العین دیا جس میں سیاست و حکومت کو بنیادی حیثیت حاصل ہو (مودودی لٹریچر سے حوالہ دیتے ہوئے) "ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے ——— اسی لئے دین میں امامت صالحہ کے قیام اور نظام حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا۔ جس سے انسان، اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے (تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں") صفحہ ۲۶

دین کا مفہوم

"تعبیر کے اس نقشہ میں دین کا جو تصور قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے:" "دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے۔ جو زمانہ حال میں "اسٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اسکی اطاعت کرنا یہ اسٹیٹ ہے۔ یہی دین کا مفہوم بھی ہے۔" (سیاسی کشمکش حصہ سوم)

انبیا کی بعثت

انبیاء کے بعثت کی غرض و غایت کیا تھی۔ اس کا جواب اس فکر کے سانچہ میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے۔ "نبی کے کام کی نوعیت" کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:۔

"دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے مشن کا منتہائے مقصود یہ رہا ہے کہ "حکومت الٰہیہ" قائم کر کے اس پورے نظام زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے۔ وہ اہل جاہلیت کو یہ حق دینے کے لئے تیار تھے کہ اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں۔ اور جس حد کے اندر ان کے عمل کا اثر انہیں کی ذات تک محدود رہتا ہے اس میں اپنے جاہلی طریقوں پر بھی چلتے رہیں۔ مگر انہیں یہ حق دینے کیلئے تیار نہ تھے اور فطرۃً نہ دے سکتے تھے کہ اقتدار کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو جاہلیت کے قوانین پر چلائیں۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔" (تجدید و احیائے دین) (صفحہ ۲۸)

حضرات انبیا کی طرف غلط انتساب:۔ (جناب وحید الدین خاں

صاحب اس موقع پر اپنے حاشیہ میں تحریر فرماتے ہیں ۔) :-

" انبیاء کی طرف یہ انتساب صحیح نہیں کہ اگر سیاسی اقتدار کی کنجیاں ہاتھ آجائیں۔ تو وہ اہل جاہلیت کو یہ حق دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ کہ وہ اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں۔" (ص ۲۸۔ حاشیہ)

اسلامی جماعت

" جب " اسلام " ایک سیاسی فکر بن جائے تو " اسلامی جماعت " کا سیاسی پارٹی کی شکل اختیار کرنا ضروری ہے ۔ (لٹریچر سے حوالہ و تائید ملاحظہ ہو)

(اسلام کی) دعوت جو لوگ قبول کر لیں وہ ـــــ اسلامی جماعت کے رکن بن جاتے ہیں ۔ اور اس طرح وہ بین الاقوامی انقلابی پارٹی تیار ہوتی ہے ۔ جسے قرآن " حزب اللہ " کے نام سے یاد کرتا ہے ـــــ یہ مذہبی تبلیغ کرنے والے واعظین اور مبشرین کی جماعت نہیں بلکہ ـــــ خدائی فوجداروں کی جماعت ہے ۔ اور اس کا کام یہ ہے کہ دنیا سے ظلم، فتنہ، فساد، بداخلاقی، طغیان اور ناجائز انتفاع کو بزور طاقت مٹا دے ـــــ لہٰذا اس پارٹی کیلئے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔" (تفہیمات حصہ اول) (ص ۲۹)

معراج کا واقعہ

دین کی سیاسی تعبیر کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی حقیقتوں کے تعارف کے لئے ذہن کو جو بہترین الفاظ ملے وہ وہی تھے جس میں واقعات و حقائق سیاسی غلاف میں لپٹے ہوئے نظر آئیں :-

(مودودی لٹریچر کی روشنی میں) " یہ کرۂ زمین جس پر ہم آپ رہتے ہیں خدا کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہے ۔ اس صوبہ میں خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھیجے گئے ہیں ۔ ان کی حیثیت کچھ اس طرح کی سمجھ لیجئے کہ جیسا دنیا کی حکومتیں اپنے

ماتحت ملکوں میں گورنر یا وائسرائے بھیجا کرتی ہیں۔" ایک لحاظ سے دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے"

"آپؐ کو اپنے مشن کی تبلیغ کرتے ہوئے تقریباً بارہ سال گذر چکے تھے ــــــــــ

اور آپ کی تحریک ایک مرحلے سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں قدم رکھنے کو تھی ــــــــــ

اور اسلام کی تحریک ایک اسٹیٹ میں تبدیل ہونے کو تھی۔ اس لئے اس موقع پر ایک نیا پروانہ تقرری اور نئی ہدایات دینے کیلئے بادشاہ کائنات نے آپ کو اپنے حضور میں طلب فرمایا ــــــــ اسی پیشی و حضوری کا نام معراج ہے" (معراج کی رات) (صـ۳۴ صـ۳۵)

ان عبارتوں میں ہر شخص صاف طور پر دیکھ سکتا ہے کہ کس طرح دین کا ہر جزو سیاسی شکل اختیار کر گیا۔ زندگی اور کائنات کے تصور پر اسی طرح سیاسی رنگ چھا گیا جیسے مارکس کی تشریح میں تمام چیزوں پر معاشی رنگ چھایا ہوا ہے۔ نصب العین نے سیاسی نوعیت اختیار کر لی دین سیاسی سانچہ میں ڈھل گیا۔ انبیاء کی بعثت میں سیاسی مقاصد کار فرما نظر آنے لگے۔ امت مسلمہ اپنی اعلیٰ ترین حیثیت میں ایک قسم کی سیاسی پارٹی ہو کر رہ گئی عبادات بھی سیاست کا ضمیمہ قرار پائیں ــــــــــ معراج ایک طرح کا سیاسی سفر بن گیا۔ غرض سارا دین ایسے اجزاء کا مجموعہ بن گیا۔ جن کی معنویت سیاست کے حوالے کے بغیر سمجھی نہ جا سکے۔ (صـ۳۶)

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ مولانا مودودی نے اگر سیاست کو دین کا مرکزی جزو بنا یا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دین میں سیاست کا مقام یہی ہو۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے؟ محض دعویٰ یا ادبی تحریریں تو اس کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ یقینی طور پر اس کا ثبوت قرآن و حدیث کی روشنی میں ہونا چاہئے اور ثبوت بھی وہ جو عبارۃ النص میں براہ راست طور پر موجود ہو سکے۔ اور قسم کی دلیل سے اسکو ثابت کرنے کی کوشش صرف دعویٰ کو کمزور کرنا ہے۔" (صـ۳۷)

(اسکے بعد جناب وحیدالدین خاں صاحب نے مسئلہ کے دلائل سے بحث کی جنہیں ہم حذف کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔)

"اصل یہ ہے کہ اسلام میں انفرادی احکام اور اجتماعی احکام کی نوعیتیں جدا گانہ ہیں۔ اس تعبیر کی غلطی یہ ہے کہ وہ دونوں کو ایک درجہ میں رکھ دیتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو آیات و احادیث سے ثابت نہیں ہوتی۔" (صفحہ ۵)

انفرادی واجتماعی احکام کا باہمی فرق

"انفرادی ہر شخص سے ہر حال میں مطلوب ہیں۔ جن احکام کی تعمیل کسی شخص کی اپنی مرضی پر منحصر ہو وہ اس وقت اس پر فرض ہو جاتے ہیں۔ جبکہ وہ اسکی تعمیل کی پوزیشن میں ہو۔ مگر اجتماعی احکام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اسی وقت روبعمل آنے ہیں جب پورا معاشرہ ان کو عمل میں لانے کے لئے تیار ہو یہی وجہ ہے کہ یہ احکام ہمیشہ اس وقت نازل ہوئے ہیں جب اہل ایمان نے اپنے درمیان سیاسی تنظیم قائم کر لی تھی۔ اور وہ اس حیثیت میں ہو گئے تھے کہ اس قسم کے سماجی قوانین کو بزور نافذ کر سکیں۔ شریعت کے اجتماعی احکام کا مخاطب با اختیار مسلم معاشرہ ہے۔ نہ کہ منتشر اور منفرد اہل ایمان"۔ (ص ۵)

——— حقیقت یہ ہے کہ تمدنی اور اجتماعی احکام کا مخاطب صرف اہل ایمان کا وہ گروہ ہے جو ان احکام کو عمل میں لانے کی حیثیت میں ہو۔ محدود دائرہ اختیار رکھنے والے اہل ایمان کو یہ حکم ہی نہیں دیا گیا ہے کہ وہ سماجی اور ملکی پیمانے پر مدنی احکام کو نافذ کریں۔

احکام کی تعمیل ایک عملی مطالبہ ہے اور کوئی مطالبہ صرف ان ہی لوگوں سے کیا جا سکتا ہے۔ جو پہلے سے اس کا اقرار کر چکے ہیں۔ اور اسی کے بقدر کیا جا سکتا ہے جتنا بالفعل ان کے لئے ممکن ہے۔ شریعت کا واضح اصول ہے کہ "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا"۔ —— یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے اوپر اتنے ہی عمل کی ذمہ داری ڈالتا

ہے جتنا اسکے "دسع" بہ ہو، دسع سے زیادہ کا مکلف ٹھہرانا اللہ کا طریقہ نہیں۔ پھر اہل ایمان کو ایسے احکام کیونکر دیئے جا سکتے ہیں۔ جبکو وہ تعمیل کرنے کی حیثیت ہی نہ ہوں۔ (صـ۵۱)

"اہل ایمان کا دائرہ جس نسبت سے پھیلتا ہے اسی نسبت سے دین کے تقاضے بڑھتے جاتے ہیں جب تنہا ایک شخص مومن ہو تو اس پر دین کا اتنا ہی حصہ فرض ہوگا جتنا اسکی ذات سے متعلق ہے ———————

——————— اور جب اہل ایمان کا کوئی گروہ ایک با اختیار معاشرہ کی حیثیت حاصل کر لے تو اس وقت پورے معاشرہ کا فرض ہوگا کہ خدا کی طرف سے اس کے معاشرتی معاملات کے لئے جتنے بھی احکام دیئے گئے ہیں۔ وہ ان سب کی مکمل پابندی اختیار کرے اور چونکہ معاشرے کے پیمانے پر عمل اقتدار کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسلئے جب اہل ایمان کا کوئی معاشرہ اس حکم کا مخاطب ہو تو لازمی طور پر یہ مفہوم بھی اس میں شامل ہوگا۔ کہ وہ اپنے اوپر ایک سیاسی امیر مقرر کریں۔ اور اسکے ماتحت اجتماعی زندگی بنا کر تمام شرعی، قوانین کا اجراء عمل میں لائیں۔ نصب امامت کا مسئلہ اس آخری صورت حال سے متعلق ہے جو متفقہ طور پر واجب ہے۔ (صـ۵۲)

(آگے چل کر فرماتے ہیں۔) "یہاں صرف ایک نتیجہ کی طرف اشارہ کردوں گا جو مولانا مودودی کی تعبیر دین کے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوا وہ یہ کہ اس تعبیر نے اسلامی تاریخ کا تصور بدل دیا۔ اسکی واضح مثال مولانا مودودی کی دو اہم تحریریں "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" اور "تجدید و احیائے دین" ہیں۔ پہلی کتاب میں قرآن کی اصطلاحات اربعہ (الٰہ، رب، عبادت، دین) کی تشریح کی گئی ہے ———————

——————— مولانا نے اپنی اس کتاب میں اصطلاحات اربعہ کے تمدنی و سیاسی مفہومات کی نقاب کشائی فرمائی ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تعبیر کی غلطی باب چہارم) (صـ۵۵)

"قرآن الفاظ کی تشریح میں اتنی بڑی غلطی کیسے ہوگئی۔ اور کس طرح وہ سارے عالم اسلام میں صدیوں تک جاری رہی۔ اس کا سادہ سا جواب مولانا مودودی کے نظریہ کے مطابق یہ ہے کہ ــــ "پچھلے لوگوں نے دین کو صحیح طور پر سمجھا نہیں تھا"۔ اس طرح زیر بحث فکر کو اپنی تسکین کا سامان تو مل گیا مگر اس سے اسلامی تاریخ کی نوعیت بدل گئی۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں کم از کم نظریاتی طور پر تسلسل پایا جاتا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ صحیح نہیں تھا۔ کیونکہ اسلامی تاریخ اپنی طویل ترین مدت میں ایک زبردست خلا سے دوچار رہی ہے۔ جسکو مولانا مودودی کے ظہور سے پہلے کسی نے ختم نہیں کیا"۔ (ص ۵۶)

(خاں صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں)

اب تک کوئی مجدد بھی کامل نہیں ہوا "جب نظری اور عملی اعتبار سے قرآن کا اصل مدعا ہی مستور ہوگیا تو عملی طور پر علماء و مصلحین کی اسلامی کوشش کا اس سے متاثر ہونا لازم ہے ـــــــــــــــــــــــ

ــــ دین کے سیاسی آئینہ میں دیکھنے پر معلوم ہوا کہ چودہ برس کی تاریخ میں اب تک کوئی ایک شخص بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جس کو پورے معنوں میں مجدد کہا جا سکے۔ مولانا مودودی نے اس سوال کو اس طرح حل کیا کہ انہوں نے کہا کہ مجدد دو قسم کے ہوتے ہیں ایک جزوی اور دوسرے کامل۔ اب تک جتنے مجدد پیدا ہوئے وہ سب کے سب جزوی مجدد تھے۔ مولانا مودودی کے الفاظ میں "مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے" (بحوالہ ص ۵۶)

مگر یات یہیں ختم نہیں

انبیاء میں بھی جزوی نبی اور کامل نہیں ہوئے ہیں ہوتی بلکہ اور آگے جاتی ہے۔ جیسا کہ مولانا مودودی نے لکھا ہے عملی طور پر مجدد کو فی الجملہ اسی نوعیت کا کام کرنا ہوتا ہے۔ جو نبی کے کام کی نوعیت ہے"۔

مجدد اور نبی میں مولانا کی اپنی تشریح کے مطابق جو بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ نبی صاحب وحی ہوتا ہے۔ جب کہ مجدد پر وحی نہیں آتی ـــــــ اب اگر دین کی مندرجہ بالا سیاسی اور انقلابی تشریح کو مان لیا جائے تو اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ مجددین امت کی طرح (نعوذ باللہ خود انبیاء میں بھی جزی نبی اور کامل نبی ہوئے ہیں۔ کیونکہ معلوم ہے کہ انبیا کی اکثریت اپنے علاقہ میں سیاسی انقلاب لانے میں کامیاب نہیں ہوئی انبیاء کی بیشتر تعداد نے حیثیت کے فرق کے ساتھ عملی طور پر تقریباً اسی نوعیت کا کام کیا ہے۔ جو جزدی مجددین کی زندگیوں میں نظر آتے ہیں ـــــ مولانا مودودی کے الفاظ میں ـــــــــ

ـــــــ بعض کی مساعی صرف زمین تیار کرنے کی حد تک رہیں جیسے حضرت ابراہیم نے انقلابی تحریک عملاً شروع کردی۔ مگر حکومت الٰہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی ان کا کام ختم ہوگیا۔ جیسے حضرت مسیح اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہونچادیا جیسے حضرت موسیٰ اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

گویا اسی تشریح کے مطابق حضرت ابراہیم خلیل اللہ بھی ایک جزدی نبی تھے۔ جو اسلام کی انقلابی تحریک کو کامیابی کی منزل تک نہ پہونچا سکے ـــــ حقیقت یہ ادنیٰ انحراف بھی دین میں کیسی کیسی خرابیاں پیدا کر دیتا ہے۔ یہ بات بھی محض رعایتہً کہی جا سکتی ہے۔ ورنہ حکومت اور سیاست کا جو تصور مولانا مودودی نے دیا ہے۔ اور مستقبل کے مجدد کامل کا جو انقلابی نقشہ انہوں نے اپنی کتاب (تجدید احیائے دین) میں پیش کیا ہے۔ اسکے لحاظ سے تو خود حضرت موسیٰ اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کم از کم اپنی زندگی میں اس طرح کا کوئی نظام قائم نہ کر سکے تھے"۔ (صفحہ ۵۱)

جب دیکھنے کا رخ بدل جائے تو تصویر میں فرق پیدا ہو جانا لازمی ہے ـــــــ دین کی سیاسی تعبیر کی روشنی میں دیکھا جائے تو نظر آئے گا کو گویا ہماری دینی تاریخ ایک بہت بڑے خلاسے دوچار رہی ہے۔ ساری اسلامی تاریخ میں نہ تو دین کا صحیح اور مکمل تصور موجود تھا

اور نہ کوئی ایسا شخص پیدا ہوا جو دین کے صحیح اور مکمل کام کو انجام دے سکتا ——— کیا اس تعبیر کو غلط قرار دینے کے لئے اسکے بعد بھی کسی دلیل کی ضرورت ہے۔ دین کے بارے میں جس نظریہ کے صحت پر ایمان لانے کے لئے اسلامی تاریخ کو غلط ماننا پڑے ۔ وہ نظریہ خود قابل رد ہے نہ یہ کہ اسکی بنا پر تاریخ کو غلط قرار دیا جائے ۔ (ص ۱۶)

عرض مرتب

یہ جناب مولانا وحید الدین خاں صاحب جن کے تاثرات اوپر نقل کئے گئے پہلے جماعت اسلامی ہند کے رکن اور شعبۂ تصنیف و تالیف سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ موصوف نے اب سے بہت پہلے "تعبیر کی غلطی" کے نام سے ایک مفصل روداد شائع کی تھی۔ جس میں جماعت سے اپنے اختلافات اور اکابر جماعت سے پوری مراسلت علامہ مودودی سے خط و کتابت بھی شائع کردی تھی۔ اور جماعت سے اپنی علیحدگی پر مکمل بیان دیا تھا - دین کی سیاسی تعبیر اسی کتاب کا خلاصہ ہے - راقم السطور نے اوپر کے صفحات میں اس خلاصہ کی ہی یہ تلخیص پیش کی ہے - اور از راہ دیانت پوری کوشش کی ہے کہ مصنف کے خلاف منشاء کوئی حذف و اضافہ نہ ہونے پائے ۔ (احقر مرتب)

عبد القدوس رومی غفرلہ